رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ | جلد ۳۶ | عدد ۳

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک' اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے | اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

روداد اجتماع دارالاسلام

حسبِ اعلان ۲۶، ۲۷ مارچ کو دارالاسلام (متصل پٹھان کوٹ) میں ارکان جماعت اسلامی (پنجاب، سندھ، سرحد، کشمیر و بلوچستان) کا اجتماع ہوا جس میں مرکز کی منظوری سے بعض ہمدردانِ جماعت بھی شریک ہوئے۔ یو.پی اور بہار سے جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی (امرائے میر، ضلع اعظم گڑھ) اور جناب سید محمد حسنین صاحب (امیر بابرائے، دربھنگہ) بھی تشریف لے آئے تھے۔ تعداد حاضرین قریباً ۱۵۰ تھی۔

۲۶ مارچ کو ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے دوپہر تک اور پھر نماز ظہر سے نماز عصر تک مختلف مقامات سے آنے والے گروہوں نے جنابِ امیر کے سامنے کھلی ملاقاتوں میں مقامی حالات پیش کیے، اپنی اپنی کارگزاریوں کا مختصر تذکرہ کیا، اپنی مشکلات بیان کیں اور ضروری امور میں مشورے حاصل کیے۔ اسی دوران میں چند اصحاب نے اپنے آپ کو رکنیتِ جماعت کے لیے پیش کیا۔ اس پر جناب امیر نے چند اہم نکات بیان فرمائے جنھیں تسلسل کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"ہمارے ہاں جماعت کی شرکت میں تو کوئی دشواری نہیں ہے مگر شرکتِ جماعت سے جو ذمہ داریوں کا جو بارِ گراں اٹھانا پڑتا ہے اس کے وزن کو، آگے بڑھنے سے پہلے محسوس کر لینا چاہیے۔ رکنیت کی ذمہ داریوں کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جو لوگ ہماری طرف بڑھ آئے ہیں وہ نصب العین میں متحد ہونے کے باوجود زیادہ دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداءً طریقِ کار کے اختلاف پر گہری نظر نہیں ہوتی لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے یہ اختلاف ابھرنے لگتا ہے اور لوگ اپنے اپنے پسندیدہ طریقِ کار کی محبت کے جوش میں آکر نظمِ جماعت کی خلاف ورزی کر بیٹھتے ہیں اور

بسا اوقات نصب العین تک سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ حضرات نے بہت اچھی طرح سے ہمارے طریقِ کار کو سمجھ لیا ہو اور اس کے ساتھ دوسرے طریقہائے کار اور ہمارے طریقِ کار کا فرق ذہن نشین ہو گیا ہو، نیز آپ برضا و رغبت دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر ہمارا طریقۂ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہوں تو آئیے بسم اللہ! ورنہ جلدی نہ کیجیے۔ ہمارے لٹریچر کا بغور مطالعہ کرتے رہیے اور ہمارے کام کو مزید کچھ عرصہ دیکھ کر آخری رائے قائم کیجیے۔

الحمدللہ کہ مسلمانوں میں ابھی تک صحیح العقیدہ لوگوں کی ایک خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس حق موجود ہے مگر فرق بس اتنا ہے کہ عموماً مختلف گروہ کسی جز و حق کو لے کر چل رہے ہیں، بخلاف اس کے ہم پورے حق کو لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ آپ حضرات کے ساتھ پہلے جو جزو حق تھا وہ بدستور ساتھ رہے گا، مگر اس پر اکتفا نہ کیجیے، اب آپ کو دوسرے اجزائے حق بھی اس کے ساتھ شامل کر لینے ہیں"۔

اس کے بعد ایک موقع پر طریقِ تبلیغ کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس سلسلہ میں جناب امیر نے مجملاً یوں اظہارِ خیال کیا:۔

"جہاں تک تبلیغ مسلک کا تعلق ہے عام طور پر مسلمانوں کی جماعتیں تشدد سے کام لیتی ہیں اور تندیِ جذبات اور مناظرانہ داؤ پیچ اور تیزیٔ زبان کے مظاہرہ سے لوگوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے مسلک کی تبلیغ کے لیے یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ اس معاملہ میں بے حد صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ تحریری و تقریری مناظرے اور بحثیں جو عام طور پر مروج ہیں ان میں مبلغ غیر محسوس طور پر غضب للنفس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور محسوس تک نہیں کرتا کہ میں خود اپنے محبوب نصب العین کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ رہا ہوں۔ بخلاف اس کے ہمیں ایک ڈاکٹر کی طرح کام کرنا ہے جو آخر دم تک کوشش کرتا ہے کہ بیمار عضو تندرست ہو جائے۔ اور اگر اسے کامیابی

جسم سے الگ کرتا ہے تو اس وقت جبکہ وہ دوسری تمام تدابیر کو آزما چکنے کے بعد اس کی علاج پذیری سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ ہمارے ڈاکٹر سب سے پہلے بیمار عضو کو کاٹ پھینکنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھیے کہ یہ عوام کا جو انبوہ آپ کے گرد پھیلا ہوا ہے ان میں سے جو جو لوگ کفر، شرک یا فسق کے مریض ہیں، ان کا علاج غصہ اور تلخی سے کرنے کے بجائے صبر اور ہمدردی سے کرنا ہے۔ ان بیمار اعضاء کو معاً کاٹ کر نہیں پھینک دینا ہے بلکہ ان پر تمام دوسری بہتر تدابیر کو آزمانا ہے۔

عوام کی معذوری کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان لوگوں میں بہت سے مشرکانہ عقائد اور رسوم خود مذہبیت ہی کے مقدس دروازہ سے داخل ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اصلاح کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس مہم کو صبر و تحمل ہی سے سر کیا جا سکتا ہے۔ عرب میں بھی یہی حالات تھے اور وہاں بھی ٹھنڈے طریقوں سے تبلیغ کا کام کیا گیا۔

پہلی باقاعدہ نشست - پروگرام کے مطابق پہلی نشست اسی روز نماز مغرب سے لے کر نماز عشا سے کچھ پہلے تک جاری رہی۔ اس نشست میں جناب امیر نے اپنی تقریر میں جماعت کے کام اور اس سے متعلق ضروری مسائل پر مفصل تبصرہ کیا۔ یہ تبصرہ بلا کم و کاست تھا۔ اس کا مقصد نہ تو مخالفین کو مرعوب کرنا تھا اور نہ رفقاء کے جذبات کو برانگیختہ کرنا مد نظر تھا۔ بلکہ اس تقریر سے جماعت کو اس کے کمزور پہلوؤں پر متوجہ کیا گیا تاکہ لوگ ان کی اصلاح کی فکر کریں۔ تقریر ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

امیر جماعت کی تقریر

خطبۂ مسنونہ کے بعد :

حضرات! جیسا کہ آپ نے خود بھی اندازہ کیا ہو گا، ہمارے اجتماع کی نوعیت اصطلاحی "جلسوں"

سے بالکل مختلف ہے۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں زیادہ تر تقریریں ہوتی ہیں، جلوس نکلتے ہیں، نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس نوعیت کی کوئی چیز یہاں نہ ہوئی نہ کبھی ہوگی۔ ہمارے ان اجتماعات کے انعقاد کی اصل غرض ہنگامہ آرائی نہیں ہے اور نہ توجہاتِ عوام کو اپنی طرف کھینچنا مقصود ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہوں، باہم قریب تر ہو جائیں، آپس میں تعاون کی سبیلیں نکالیں، صاحب امر آپ سے اور آپ صاحب امر سے شخصاً واقف ہوں اور اسے آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں کا ٹھیک اندازہ ہو تاکہ وہ آپ سے منظم کام لینے کی کوشش کرے، وقتاً فوقتاً ہم اپنا اور اپنے کام کا جائزہ لیتے رہیں، اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو سمجھیں اور انہیں دور کرنے کی فکر کریں اور باہمی مشوروں سے اپنے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں سوچیں۔ غرض ہمارے یہ اجتماعات اپنے اندر عملی روح رکھتے ہیں، ان میں جلسوں کی نوعیت کی کوئی چیز نہ آپ پا سکتے ہیں نہ آپ کو اسے پانے کی خواہش کرنی چاہیئے۔ اگر ابھی تک جلسہ بازی کی پرانی عادتوں کا کچھ اثر آپ میں موجود ہو اور ان چیزوں کی کوئی تشنگی آپ اپنے اندر پاتے ہوں تو اسے بھی نکالنے کی کوشش کیجئے۔ ان ہنگاموں میں فی الواقع کچھ نہیں رکھا ہے۔ فضول کاموں میں ذرہ برابر وقت ضائع نہ کیجئے۔ بس کام کی بات کیجئے اور پھر اپنا فرض ادا کرنے میں لگ جائیے۔ آج صبح سے میں مختلف مقامات کی جماعتوں اور اشخاص کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ کبھی کبھی غیر ضروری باتیں کرنے کی خواہش لوگوں میں عود کر آتی ہے اور بسا اوقات بیان مطابقِ حقیقت نہیں رہتا۔ یہ ایک کمزوری ہے جسے دور کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ جو عادتیں مدت دراز سے جڑ پکڑے ہوئے ہیں وہ چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹیں گی مگر انہیں چھوڑنے کی طرف آپ کی توجہ اور سعی ضروری ہے۔

اب تک مختلف مقامات پر جا کر جو کچھ میں نے دیکھا اور باہر کی اطلاعات سے جو اندازہ لگایا اور آج آپ حضرات سے فرداً و مجتمعاً تبادلۂ خیال کر کے جو معلومات حاصل کیں ان کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہماری انتہائی احتیاط کے باوجود ایک اچھی خاصی جماعت ہمارے نظام میں ایسی داخل ہو گئی ہے

جسے فی الواقع اس کام سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی کے اس فقدان کی نمایاں علامت یہ ہے کہ یہاں اجتماع کے لئے دعوت عام دی گئی تھی اور اعلان کیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ارکان شریک ہونے کی کوشش کریں، مگر بہت سے ارکان کسی عذر معقول کے بغیر نہیں آئے، بلکہ بہت سوں نے عذر پیش کرنیکی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ لوگوں کے لئے ان کے معمولی کام، ان کے روزمرہ کے مشاغل، انکے خانگی امور، انکے دنیوی مفاد اس سے بڑھکر اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ جماعت کی پکار پر لبیک کہیں اور اسی بنا پر وہ غیر اولی الضرر ہونیکے باوجود بیٹھے رہ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء کو اس کام سے حقیقی دلچسپی و وابستگی نہیں ہے۔ اگر فی الواقع وہ جانتے کہ یہ اجتماع کیا معنی رکھتا ہے اور جماعت کی پکار سے ان پر کیا لازم آجاتا ہے اور جو عہد انہوں نے اپنے رب سے کیا ہے اس سے کیا ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں تو وہ اپنے بڑے سے بڑے دنیوی فائدے اور سخت سے سخت مشغولیت کو بھی یہاں کی حاضری پر ہرگز ترجیح نہ دیتے۔ جب آج ان کا یہ حال ہے تو کیا امید کی جاسکتی ہے کہ کل کوئی بڑی مہم سامنے ہو اور ہم انہیں پکاریں تو وہ ہماری پکار پر لبیک کہیں گے۔ نظام جماعت سے منسلک ہوجانے کے بعد آدمی کے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ جماعت کی پکار سنکر دوڑ پڑے اور سارے کام چھوڑ دے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ حالات ہیں جن میں خدا اور رسول نے خود رخصت دی ہے۔ اُن حالات کے سوا باقی تمام حالات میں جماعت کی شرکت کیلئے دوسری ہر مشغولیت سے قطع نظر کرلینا لازم ہے۔ جب تک ارکانِ جماعت میں یہ کیفیت پیدا نہ ہوگی، نظامِ جماعت بالکل بے جان رہے گا۔ کسی شخص کا یہ خیال کرکے بیٹھ رہنا کہ اس وقت کوئی خاص کام نہیں ہے، اجتماع کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے، اگر اس وقت میں شریک نہ ہوا تو کوئی نقصان نہ ہوگا، درحقیقت ایک غلط خیال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہاں سرے سے کوئی کام نہ ہوتا بلکہ آپ کو صرف جمع ہوجانے کے لئے پکارا جاتا تب بھی آپ کو ایک آواز پر جمع ہوجانا چاہیئے تھا، کیونکہ اس ابتدائی مرحلہ میں بھی بجائے خود ایک اہم کام ہے کہ آپ کے اندر ایک آواز پر جمع ہوجانے کی استعداد پیدا ہو۔ اس ڈسپلن کے بغیر آپ

کونسا کام تنظیم اور تعاون کے ساتھ کر سکیں گے؟

یہ سرد مہری جس کا اظہار اس اجتماع کے موقع پر ہوا ہے، کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے جو اس وقت رونما ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ متعدد مقامات پر ہماری جماعت کے بعض یا اکثر ارکان ہفتہ وار اجتماعات میں شریک نہیں ہوتے، یا شریک ہوتے ہیں تو التزام کے ساتھ نہیں بلکہ "گنڈے دار" طریقہ سے کہ جب دنیا کی کوئی چھوٹی بڑی مشغولیت انہیں نہ ہوئی اور تفریح کو بھی جی چاہا تو مقامی جماعت کے اجتماع میں آ گئے۔ بعض مقامات پر تو ہفتہ وار اجتماع کا قاعدہ ہی سرے سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اور بہت سے ارکان ایسے بھی ہیں جو جماعت میں داخل ہوئے اور جان بوجھ کر خدا سے عہد غلامی تازہ کرنے کے بعد بھی ویسے ہی ٹھنڈے، بے روح اور جامد و ساکن ہیں جیسے اس سے پہلے تھے۔ نہ انکی زندگی میں کوئی تغیر واقع ہوا، نہ جاہلیت کے ماحول سے انکی کوئی جنگ ٹھنی، نہ دعوت الی اللہ کے لئے کوئی سرگرمی ان میں پیدا ہوئی، اور نہ ہم سفر رفیقوں کے ساتھ کوئی وابستگی انکے اندر پائی گئی۔ حالانکہ ہم نے ابتدا میں جماعت قائم کرتے وقت بھی کہدیا تھا اور اسکے بعد بھی بار بار کہتے رہے ہیں کہ ہمیں کثرت تعداد کی نمائش کرنے کے لئے ارکان کی فضول بھرتی نہیں کرنی ہے، ہمیں وہ فربہی مطلوب نہیں ہے جو جسم کو طاقتور بنانے کے بجائے الٹا بوجھل بنا دے، ہمیں صرف ان لوگوں کی ضرورت ہے جنہیں فی الواقع کچھ کرنا ہو اور جو کسی خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ اپنے ایمان کے اندرونی تقاضے سے خدا کے دین کو قائم کرنے کی سعی کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان پے در پے تصریحات کے باوجود اُس قسم کے لوگ ہمارے اس نظام میں بھی داخل ہو گئے جو اس سے پہلے محض مسلمانوں کے گروہ سے متعلق ہونے ہی کو نجات کے لئے کافی سمجھ لینے کے عادی رہے ہیں۔ ان سے میں عرض کروں گا کہ اگر آپکو یہی کچھ کرنا تھا تو اس غریب جماعت کو خراب کرنا کیا ضرور تھا۔ آپکو اگر فی الواقع اُس نصب العین سے ہمدردی تھی جس کی خدمت کے لئے ہماری یہ جماعت بنی ہے، اور اسی ہمدردی نے آپ کو ہم سے تعلق پیدا کرنے پر آمادہ کیا تھا، تو آپکی ہمدردی کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ آپ اس

جماعت کو خراب کرنے سے پرہیز کرتے اور وہ بیماریاں اسے نہ لگاتے جن کی وجہ سے مسلمان مدت ہائے دراز سے کوئی صحیح کام نہیں کر سکے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ پچھلے دو سال کے دوران میں متعدد اصحاب ہمارے نظام جماعت سے الگ ہوئے ہیں اور ایک دو مستثنیات کے سوا تقریباً سب کے اندر اس علیحدگی نے رجعت قہقری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آپ جانتے ہیں، اور جو شخص بھی ہمارے طریق کار سے واقف ہے اس بات کو جانتا ہے کہ ہم نے جماعت میں لینے سے پہلے ہر شخص کو سوچنے سمجھنے کا پورا پورا موقع دیا ہے، دین کو اور اسکے مقتضیات اور مطالبات کو، اپنے مقصد کو اور اسکے حصول کے طریقے کو اچھی طرح کھول کر بیان کیا ہے، پھر داخلۂ جماعت کے موقع پر بھی ایک ایک شخص کے سامنے واضح طور پر اُن ذمہ داریوں کو پیش کر دیا ہے جو توحید و رسالت کے شعوری اقرار سے اس پر عائد ہوتی ہیں، اور اس تصریح کے بعد ہر امیدوار رکنیت سے دریافت کر لیا ہے کہ آیا وہ اس اقرار کے وزن کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے برضا و رغبت یہ بار اٹھانے کے لئے تیار ہے؟ اس طرح ہر اشتباہ و التباس اور ہر غلط فہمی کے بغیر جن لوگوں نے اقرار کیا صرف وہی جماعت میں لیے گئے۔ ایسے سوچ سمجھے اور جنچے تلے اقرار کے بعد نظام جماعت سے کسی شخص کے الگ ہونے کی اگر کوئی معقول صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ وہ ہم میں نفاق کی بُو محسوس کر کے، یا ہمارے نظام میں کوئی ناقابلِ علاج کمزوری پاکر ہم سے الگ ہوتا اور پھر ہم سے زیادہ بہتر طریقے سے، زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اُس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرتا جس کو اس نے خوب ٹھنڈے دل سے جان بوجھکر اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا تھا۔ اور اس صورت میں بعید نہ تھا کہ اسکو اپنے سے آگے پاکر ہم خود اس سے جا ملتے۔

لیکن یہاں جو صورتِ حال دیکھنے میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے پورے شعور کے ساتھ، جلد بازی میں نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھکر، ہم سے نہیں بلکہ اپنے خدا سے اقرار کیا تھا، وہ جماعت سے الگ ہوئے اور الگ ہو کر ان میں سے بعض ساکن و جامد ہو گئے، بعض ان گروہوں کی طرف پلٹ گئے جن کے متعلق وہ کہتے

تھے کہ انکے طریقوں کو غلط پاکر اور ان سے مایوس ہو کر "دعلی وجہ البصیرت" ، ادھر آئے ہیں اور بعض ظالم تو ایسے پلٹے کہ جو دینداری اور پابندی شریعت انہوں نے اختیار کی تھی اور اخلاقی اصلاح کے جو اثرات قبول کیے تھے ان کے بھی بیشتر حصہ پر خط نسخ پھیر دیا اور وہی سب کچھ کرنا شروع کر دیا جو پہلے کرتے تھے چند اصحاب کے اندر رجعت کی شدت کا یہ حال دیکھ رہا ہوں کہ نماز تک کے تارک ہو گئے ہیں جن حرام چیزوں سے پرہیز کرنے لگے تھے ان میں پہلے سے بھی کچھ زیادہ مبتلا ہو رہے ہیں، اور معروف اخلاقی ذمہ داریوں تک سے بے پروا ہوتے جاتے ہیں۔ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ ان حالات کو دیکھکر مجھے کس قدر رنج ہوتا ہے۔

ہمیں سوچنا چاہیے کہ ان سرد مہریوں، ان عہد فراموشیوں اور ان رجعتوں کے حقیقی اسباب کیا ہیں میرے نزدیک پہلی اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ جس قوم میں کام کرنے کے لئے ہم اُٹھے ہیں، صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اسکے اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اس میں کیرکٹر کی وہ طاقت بہت ہی کم باقی رہ گئی ہے جس کی مضبوط چٹان پر اٹل فیصلے، مستقل ارادے، ثابت عزائم، اور بھروسے کے قابل عہد و میثاق قائم ہوتے ہیں۔ اس میں مدتہائے دراز سے یہ کمزوری پرورش پا رہی ہے کہ ایک چیز کو حق جانیں اور دل سے اسے حق مانیں مگر اس کے لئے کوئی قربانی گوارا نہ کریں، نہ وقت کی نہ مال کی، نہ خواہشات نفس کی، نہ اپنے مرغوب افکار و نظریات کی، نہ اپنے جاہلیت کے اذواق اور دلچسپیوں کی اور نہ کسی اور چیز کی۔ انہیں وہ حق پرستی تو بہت اپیل کرتی ہے جس میں حق کو زبان سے حق کہنا اور اس پر لفظی عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنا اور اس کے لئے چند نمائشی کام کر دینا کافی ہو اور اسکے بعد انہیں اس حق کے خلاف ہر طرح اپنے کاروبار، اپنے ادارے، اور اپنی زندگی کے سارے معاملات چلانے کی پوری آزادی حاصل رہے۔ اسی لئے وہ نام نہاد مذہبیت کے اُن راستوں کی طرف خوشی خوشی لپک جاتے ہیں جن کی دینداری اور سعی و عمل کا سارا مدار اسلام اور جاہلیت کی مصالحت (COMPROMISE) پر ہے۔ لیکن ایسی حق پرستی ان کیلئے ایک ناقابل تحمل بارِ گراں ہے جو کفر و اسلام، حق و باطل اور اطاعت و

فہرست مضامین

ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۳۶۳ھ (مارچ اپریل ۱۹۴۴ء) جلد ۲۴ عدد ۲،۳

روداد اجتماع دارالاسلام	ابوالسلام نعیم صدیقی۔	۹۸
رسائل و مسائل:-		
سورۂ یوسف کے متعلق چند سوالات۔	ابوالاعلیٰ۔	۱۵۷
رشوت و خیانت کے متعلق مزید مسائل	"	۱۶۱
مقالات:-		
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر۔	"	
کیا ترک تقاضائے فطرت ہے۔	مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔	

روداد اجتماع دارالاسلام علیحدہ کتابی شکل میں بھی مل سکتی ہے قیمت فی جلد ۸/

ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ۔ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بغاوت کے درمیان دو ٹوک فیصلہ چاہتی ہو اور جس میں ہر اس شخص سے جو حق کو ماننے کا اقرار کرے، پہلا مطالبہ یہ ہو کہ وہ یکسو ہو جائے، اور پھر مزید مطالبہ یہ ہو کہ جس چیز کو اس نے حق مانا ہے اس کے لئے اپنی پوری شخصیت کو تج دے اور عمر بھر کے لئے تج دے، وقت کی، مال کی، خواہشات نفس کی، مرغوبات اور دلچسپیوں کی، امنگوں اور تمناؤں کی، توقعات اور امیدوں کی، گہرے سے گہرے تعلقات کی، قوتوں اور قابلیتوں کی، غرض ہر قسم کی قربانیاں گوارا کرے اور ایک دو دن کے لئے نہیں، چار چھ مہینے کے لئے نہیں، کسی مقررہ مدت کے لئے نہیں، بلکہ جب تک جیتا ہے اُس وقت تک گوارا کرتا رہے۔ آپ اس گئے گذرے زمانے میں بھی ایسے مسلمان بہت پا سکتے ہیں جو خوشی خوشی جان دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے، سینے پر گولیاں کھالیں گے، سروں پر لاٹھیوں کی بارش سہ لیں گے، جیل کی سختیاں برداشت کرلیں گے۔ یہ سب ان کے لئے چھوٹے اور ہلکے کام ہیں جنھیں یہ بآسانی برداشت کرسکتے ہیں۔ لیکن اپنی پوری زندگی کو ایک ضابطہ میں کس دینا، عمر بھر ایک مقصد کے پیچھے صبر سے کام کئے چلے جانا، جینے جی اپنی خواہشات پر ایک بریک لگائے رکھنا، اپنی عادتوں اور ذہنیتوں کو بدل ڈالنا، اور کسی خارجی دباؤ کے بغیر اخلاقی ذمہ داریوں کو قبول کرنا اور نباھنا، یہ فی الحقیقت ان کی برداشت سے بہت زیادہ بھاری بوجھ ہے جس کی سہار ان کے لئے سخت دشوار ہے۔ یہ نمائشی ہنگاموں میں ایک عمر گزار سکتے ہیں مگر کسی ایثار طلب عہد کو سال دو سال بھی بمشکل نباہ سکتے ہیں۔ انکے ارادے کمزور ہو چکے ہیں، انکی قوتِ فیصلہ ڈھیلی پڑ گئی ہے، ان میں عادات اور خواہشات کے انضباط اور اعتقاد و عمل کی مطابقت اور کسی نظام کی پابندی میں مسلسل کام کرنے کی قوت باقی نہیں رہی ہے۔ انکی مثال اس جنگلی گھوڑے کی سی ہے جو روزِ پیدائش سے آزاد پھرنے کا عادی رہا ہو اور کسی گاڑی میں جُت کر ایک مقرر راستہ پر سیدھا چلنے کے لئے تیار نہ ہو۔ ایسے گھوڑے کو اگر کسی طرح رام کرکے باندھ بھی لیا جائے تو بہت جلدی وہ بندشوں سے اُکتانے لگتا ہے حتیٰ کہ ایک دن رسّی تڑا کر ایسا بھاگتا ہے کہ پہلے سے بھی کچھ زیادہ دُور

نکل جاتا ہے۔

دوسری بنیادی کمزوری جسے میں روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا جا رہا ہوں، یہ ہے کہ ہمارے عوام تو دین کے فہم اور اسکی رُوح کے ادراک سے محروم ہیں ہی، مگر ہمارے درمیان جو لوگ مذہبی میلان رکھنے والے ہیں وہ اس معاملہ میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں مخلص اور نیک نیت لوگوں تک کا یہ حال ہے کہ وہ دین داری اور فنّی دینداری اور پیشہ دینداری کے فرق کو نہیں جانتے، دین کی حقیقی قدروں کو انہوں نے دوسری قدروں سے بدل لیا ہے یا غلط ملط کر دیا ہے، جو چیزیں دین میں نہایت اہم ہیں بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہیں وہ ان کی نگاہ میں، ہماری تمام کوششوں کے باوجود محض ایک ضمنی اہمیت حاصل کر سکی ہیں، کیونکہ ایک طویل مدت کی تعلیم و تلقین سے اُن کا انداز فکر کچھ ایسا ہی بنا دیا گیا ہے۔ بخلاف اسکے جو چیزیں دین میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں یا کسی قدر رکھتی بھی ہیں تو محض ایک ضمنی اہمیت، وہی انکے نزدیک مدار دین ہیں کیونکہ فن دینداری اور پیشہ دینداری نے ان کو یہی مرتبہ دیا ہے۔ عالم ہوں یا عامی یا متوسطین، بہر حال ان کے درمیان کم ہی اشخاص ایسے پائے جاتے ہیں جو صحیح دینی بصیرت کی بنا پر جانتے ہوں کہ خدا کے دین میں کونسی چیزیں کس درجہ میں مطلوب ہیں، کس چیز پر کتنا زور دینا چاہیے، اور کونسی چیز کس چیز کی خاطر چھوڑی جا سکتی ہے۔ یہ اختلاف جو قدروں کے تناسب میں ہمارے اور عام مذہبی میلان رکھنے والے لوگوں کے درمیان موجود ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ یہی بہت سی سرد مہریوں اور رجعتوں کا ایک بڑا سبب ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں کہ دین کو خوب جان کر اور سمجھ کر ہم نے اقامتِ دین کا جو نصب العین اپنے سامنے رکھا ہے اسکے ساتھ ہم بے وفائی نہیں کر سکتے اور اگر لوگوں میں سرگرمی پیدا کرنا، یا پلٹنے والوں کو رجعت سے باز رکھنا اسی پر موقوف ہے کہ دینی قدروں کے حقیقی تناسب کو بدل دیا جائے تو نہ ہمیں ایسی سرگرمی مطلوب ہے اور نہ کسی پلٹنے والے کی باز گشت، کائناً من کان۔

ایک اور اصولی سبب ان رجعتوں اور سرد مہریوں کا یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس جماعت کی رکنیت اور عام انجمنوں اور پارٹیوں کی رکنیت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ انہوں نے ابھی پوری طرح محسوس نہیں کیا ہے کہ اس جماعت کی شرکت کیا معنی رکھتی ہے۔ وہ ابھی تک اس گمان میں ہیں کہ یہ بھی کوئی انجمن ہے جس میں کسی ادنیٰ وجہِ کشش کی بنا پر شامل ہو جانا اور شامل ہو کر دلچسپی نہ لینا، اور پھر کسی چھوٹی یا بڑی وجہ ناپسندیدگی کی بنا پر الگ ہو جانا، آدمی کے دین و ایمان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا حالانکہ فی الحقیقت اس جماعت کی نوعیت عام انجمنوں اور پارٹیوں کی نوعیت سے بالکل مختلف ہے یہ جماعت خالصتاً دینِ حق کی اقامت کے لئے قائم ہوئی ہے۔ اس کا نصب العین وہی ہے جو قرآن کی رو سے اسلام کا حقیقی نصب العین ہے۔ اسکے پیشِ نظر وہی کام ہے جس کیلئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس میں داخل ہوتے وقت ہر شخص سے پورے شعور کے ساتھ وہی عہد لیا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں معاملہ بیع سے تعبیر فرمایا ہے، ان اللہ اشترٰی من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔ ایسی جماعت میں داخل ہونے کا جو شخص ارادہ کرے اسے پہلے اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے دیکھ لینا چاہیئے کہ آیا فی الحقیقت اس کی یہی غرض اور یہی نوعیت ہے اور یہی کام اسکے پیشِ نظر ہے؟ اگر تحقیق سے اس کو اس امر پر اطمینان حاصل نہ ہو تو سرے سے جماعت کی شرکت ہی غلط ہے لیکن اگر اسے اطمینان حاصل ہو جائے اور وہ یہ یقین رکھتے ہوئے داخل جماعت ہو کہ اس جماعت کی غرض و غایت یہی ہے جو دستور میں بیان کی گئی ہے، اور اس یقین کی بنا پر وہ اللہ سے خوب سوچ سمجھ کر بیع کا معاہدہ کرے تو اسکے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی شرکت اور ایسے معاہدۂ بیع کی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہو سکتی کہ ایک کوٹ ہے جسے جب چاہا پہنا اور جب چاہا اتار دیا۔ ادھر قدم بڑھانے سے پہلے اپنی واپسی کی کشتیاں جلا دیجیے۔ یہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھیئے کہ اب پلٹ کر جانے کے لئے کوئی جگہ آپ کے لئے نہیں ہے۔ خدا سے عہد باندھنے کے بعد جس جان و مال کو آپ بیچ چکے اسے اب آپ واپس نہیں لے سکتے۔ اس

معاہدہ کے ساتھ ہی آپ سر دھڑ کی بازی لگا چکے ہیں۔ اب آپکو جان لڑا کر یہ کام کرنا ہے، خود اس راہ پر چلنا ہے اور دوسروں کو چلانا ہے۔ کوئی خرابی رونما ہوتی نظر آئے تو بھاگنے کی فکر نہ کیجئے بلکہ کم از کم اسی جذبہ کے ساتھ اسے دُور کرنے کی فکر کیجئے جس طرح آپ کے گھر میں آگ لگ جائے تو اسے بجھانے کی کرینگے۔ آگے والا اگر نہ چلے تو پیچھے سے سرک نہ جائیے بلکہ یا تو اسے چلنے پر مجبور کیجئے یا اسے ہٹا کر پھینک دیجئے اور خود آگے بڑھیئے۔ یہاں آکر اگر آپ اس کام میں دلچسپی نہ لیں گے، یا وقت، مال، محنت اور دل و دماغ اور جسم و جان کی قوتیں اس راہ میں صرف کرنے سے جی چرائیں گے، یا دوسرے کاموں کو اس کام پر مقدم رکھیں گے تو اپنے خدا سے بیوفائی کرینگے۔ آپ کا عہد کسی انسان سے نہیں، خدا سے ہے۔ شرکت کے وقت جو عہد آپ نے کیا ہے اسکے ساتھ ہی آپ اپنا سب کچھ اور خود اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ اب آپ کی ہر چیز پر پہلا اور مقدم حق خدا اور اس کے کام کا ہے، باقی تمام چیزیں اس سے موخر ہیں۔

یہ ساری باتیں میں آپ سے اس لئے کہ رہا ہوں کہ آپ اُس کام کی عظمت کو اچھی طرح محسوس کرلیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مجھ پر اکثر تقاضے ہوتے رہتے ہیں کہ تم جلدی سے کوئی بڑا اقدام کر ڈالو۔ لیکن ابھی میں نے جن کمزوریوں کا ذکر آپ کے سامنے کیا ہے ان کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود اگر میں کوئی بڑا اقدام کر بیٹھوں تو مجھ سے بڑا نادان کوئی نہ ہوگا۔ سیرت و اخلاق کی ان خامیوں اور فہم و نظر کی ان کوتاہیوں کے ساتھ دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا، کجا کہ وہ کام جو دنیا میں سب سے بڑا ہے۔ دنیا کے نظام زندگی میں جو ہمہ گیر انقلاب پیدا کرنا ہمارے پیش نظر ہے اس کے لئے ایک دوسری قسم کی ذہنیت اور سیرت درکار ہے جسے ڈھالنے اور تیار کرنے کا کوئی انتظام ہمارے ہاں ایک مدت دراز سے نہیں ہوا ہے۔ جو سانچے ہمارے ہاں مدتوں سے بنے ہوئے ہیں وہ اخلاق و عادات اور ذہنیتوں اور سیرتوں کو کسی اور ڈھنگ پر ڈھالتے رہے ہیں جو اس کام کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ قبل اسکے کہ ہم اپنے پیش نظر کام کی طرف کوئی بڑا قدم اٹھائیں، ہمیں ان بوسیدہ سانچوں کو توڑنا ہے اور

نہایت صبر کے ساتھ پیہم سعی و جہد سے نئی سیرتیں، نئی ذہنیتیں، نئی عادتیں، اور نئی اخلاقی صفات پیدا کرتی ہیں، جو حقیقۃً نئی نہیں بلکہ سب کی سب پرانی ہیں مگر بدقسمتی سے آج ہمارے لئے نئی ہوگئی ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ کسی فاسد و مفسد گروہ کو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنی زمین کے انتظام اور اپنی خلق کی امامت و پیشوائی کے منصب پر قابض نہیں ہونے دیتا جب تک دنیا ایک صالح و مصلح گروہ (منتشر افراد نہیں بلکہ منظم گروہ) سے بالکل ہی خالی نہ ہو جائے، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق قیادت و رہنمائی کے منصب اور زمین کے انتظام میں کوئی اصولی تغیر بھی اس وقت تک واقع نہیں ہوسکتا جب تک ایک امۃ وسط، ایک خیر امۃ وجود میں نہ آجائے جو شہداء علی النّاس ہونے کے لائق ہو، جس کا جینا اور مرنا خالص اللہ اور اس کے دین کے لئے ہو، اور جو اپنی اخلاقی صفات کے اعتبار سے تمام دنیا کی امتوں پر فوقیت رکھتی ہو۔

اس موقع پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہدینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا، جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے، کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء، باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں، ایک مسلمان قوم کے لئے ان کو قبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے اور اس کا عذر مقبول ہونا رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعوٰی رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لئے اٹھ کھڑی ہو جو امت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے، یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کرلے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں ان دو راہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کے لئے باقی نہیں رہتی یہ عین ممکن ہے کہ اس دو ٹوک فیصلہ میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ڈھیل دے اور اس

نوعیت کی یکے بعد دیگرے کئی دعوتوں کے اُٹھنے تک دیکھنا رہے کہ وہ ان کے ساتھ کیا روش اختیار کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال اس دعوت کی طرف سے منہ موڑنے کا انجام آخرکار وہی ہے جو میں نے آپ سے عرض کر دیا۔ غیر مسلم اقوام کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ لیکن مسلمان اگر حق سے منہ موڑیں اور اپنے مقصدِ وجود کی طرف صریح دعوت کو سُن کر اُلٹے پاؤں پھر جائیں تو یہ وہ جرم ہے جس پر خدا نے کسی نبی کی امت کو معاف نہیں کیا ہے۔

اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اُٹھ چکی ہے اس لئے کم از کم ہندی مسلمانوں کے لئے تو آزمائش کا وہ خوفناک لمحہ آ ہی گیا ہے، رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی وہاں کے مسلمان بھی اِسی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔ میں یہ دعویٰ کرنے کے لئے تو کوئی بنیاد نہیں رکھتا کہ یہ آخری موقع ہے جو مسلمانوں کو مل رہا ہے۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ ممکن ہے کہ ابھی کچھ اور مواقع مسلمانوں کے لئے مقدر ہوں۔ لیکن قرآن کی بنیاد پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے یہ وقت ہے ایک نازک وقت۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت دو قسم کی دعوتیں ہیں۔ ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اُس کام کے لئے بلا رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس و تشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے۔ اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیش نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اِن دو متقابل پکاروں میں سے دوسری پکار کی طرف مسلمانوں کا فوج در فوج لپکنا اور پہلی پکار کو امت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سے سننا، اکابر امت اور علماء و مشائخ کا اس سے بے اعتنائی برتنا یا اسکی کھلی یا چھپی مخالفت پر اُتر آنا، اور ایک گروہ قلیل کا اسکی طرف بڑھنا بھی تو رکتے اور جھجکتے اور پس و پیش کرتے ہوئے بڑھنا، میرے نزدیک ایک نہایت بُری علامت ہے اور ایک عظیم خطرہ ہے جس میں یہ مسلمان قوم اپنے آپ کو ڈال رہی ہے۔ خوب جان لیجئے کہ اگر اس وقت

اس قوم میں سے کچھ آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو امۃ وسط اور شہداء اللہ بننے کے قابل ہوں اور وہ خدمت انجام دے سکیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر ایک صالح و مصلح گروہ کو کمر بستہ دیکھنا چاہتا ہے تو پھر

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

بعید نہیں کہ اللہ کسی دوسری ایسی قوم کو لے آئے جو اللہ کو محبوب ہو اور اللہ اسے محبوب ہو جو اہل ایمان پر نرم اور کفار پر سخت ہو جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے اللہ عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور علیم ہے

آپ حضرات یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ آپ دراصل امۃ وسط بننے کے امیدوار ہیں۔ آپکا مقصود یہ ہے کہ اس مقام بلند کو حاصل کریں۔ اتنے بڑے منصب کی امیدواری کے لیے اٹھ کھڑا ہونا اور پھر نہ اسکی عظمت کو محسوس کرنا، نہ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا، ایک عظیم الشان بےخبری ہے۔ اور اس سے بڑھکر بےخبری یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اُن کم سے کم صفات سے بھی ابھی تک متصف نہ ہوئے ہوں جو اس کار عظیم کے لیے ضروری ہیں اور دوسری طرف آپ تقاضا کریں کہ فوراً ہی کوئی بڑا قدم اٹھا دیا جائے۔ کیا آپ اتنا نہیں سمجھتے اور اس سے ڈرتے نہیں کہ اگر آپ نے کوئی ایسا قدم اُٹھایا جس کے لیے ضروری استعداد آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی ہے تو آپ منہ کی کھا کر پسپا ہونگے اور اس راہ میں پیچھے ہٹنا فرار من الزحف ہے جو خدا کی شریعت میں بہت بڑا گناہ ہے؟

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کم سے کم ضروری صفات کیا ہیں جو اس دعوت کے لیے کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں۔ یہ صفات تین اقسام پر منقسم ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو شخصی حیثیت سے انفرادی طور پر ہونی چاہئیں۔ دوسری وہ جو ایک صالح جماعت بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ اور

تیسری وہ جو مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے ناگزیر ہیں۔

شخصی اوصاف میں پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ہر شخص اپنے نفس سے لڑ کر پہلے اسے مسلمان اور خدا کا مطیع فرمان بنالے۔ یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ

المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ	حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے کشمکش کرے

یعنی قبل اسکے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلہ کے لیے نکلیں، اُس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اسکی رضا کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر شرابیوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ تضاد ہماری تحریک کے لئے تباہ کن ہے۔ پہلے خود خدا کے آگے سر جھکائیے پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجئے۔

جہاد کے بعد دوسرا درجہ ہجرت کا ہے۔ ہجرت کا اصل مدعا گھر بار چھوڑنا نہیں ہے، بلکہ خدا کی نافرمانی سے بھاگ کر خدا کی رضا جوئی کی طرف بڑھنا ہے۔ اصلی مہاجر ترکِ وطن اگر کرتا ہے تو اس لیے کہ اس کے وطن میں قانونِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں ہیں لیکن اگر کسی شخص نے گھر بار چھوڑا اور اللہ کی فرماں برداری ہی اختیار نہ کی تو اس نے حماقت کی۔ یہ حقیقت بھی احادیث میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے، بطور مثال ایک حدیث کو لیجئے۔ آنحضور سے پوچھا گیا کہ

ما الھجرۃ افضل یا رسول اللہ؟ — یا رسول اللہ کونسی ہجرت افضل ہے؟

جواب ملا :-

ان تهجر ما کرہ ربک یہ کہ تو ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہیں

اندر کا باغی اگر مطیع نہ ہو تو آدمی کا ترکِ وطن کر دینا خدا کی بارگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات باہر کی قوتوں سے پہلے اپنے اندر کی سرکش قوتوں سے لڑیئے اور اصطلاحی کفار کو مسلمان بنانے سے پہلے اپنے نفس کو مسلمان بنایئے۔ اس معنی کو جامع تر الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ حدیث نبوی کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنایئے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور خواہ کتنا ہی گھومے پھرے بہرحال اُس حد سے آگے نہیں جاسکتا جہاں تک رسی اُسے جانے دیتی ہے۔ مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی اخیتہ یجول ثم یرجع الی اخیتہ۔ ایسے گھوڑے کی حالت آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ہر میدان میں گھومتا ہے، ہر کھیت میں گھس جاتا ہے اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ لوٹ پڑتا ہے۔ پس آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔

اس کیفیت کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرا قدم یہ اُٹھایئے کہ اپنے قریبی ماحول سے جسے میں HOME FRONT کہوں گا، لڑنا شروع کر دیجئے۔ گھر کے لوگ، اعزہ، دوست اور سوسائٹی جس سے آپکا گہرا ربط ہے، ان سب سے ایک عملی کشمکش شروع ہو جانی چاہیے۔ کشمکش اس معنی میں نہیں کہ آپ اپنے متعلقین کے کشتی لڑیں یا ان سے تُو تُو مَیں مَیں اور مناظرہ شروع کر دیں۔ بلکہ یہ کشمکش اس معنی میں ہونی چاہیے کہ آپ بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دلدادہ اور اپنے اصول و ضوابط کے اتنے پابند ہو جائیں کہ آپ کے گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ آپکی پابند اصول زندگی کو گوارا نہ کر سکیں، آپ کی بیویاں، آپ کی اولادیں، آپ کے والدین، آپ کے رشتہ دار اور دوست

آپ کے رویہ کے خلاف مزاحمت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ اپنے شہر میں اجنبی ہو کر رہ جائیں۔ جہاں آپ کسبِ معاش کے لئے کام کرتے ہوں وہاں آپ کا وجود نمایاں طور پر کھٹکنے لگے۔ دفتر کی آرام کرسی جس پر بیٹھ کر جاہ و ترقی کے خواب دیکھے جاتے ہیں، آپ کے لیے انگاروں کی انگیٹھی بن کے رہ جائے۔ غرض جو جتنا زیادہ قریبی ہو اس سے اتنا ہی پہلے تصادم شروع ہو جانا چاہیئے۔ جس شخص کے گھر میں میدانِ جہاد موجود ہو، وہ آخر چند میل کے فاصلہ پر ہی کیوں لڑنے جائے۔ پہلا معرکہ تو گھر ہی سے شروع ہونا چاہیئے۔ اب تک جہاں جہاں سے اس کشمکش کی اطلاعات آرہی ہیں وہاں کے لوگوں سے میں مطمئن ہو رہا ہوں اور جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آرہی ہیں وہاں کے لیے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے۔

مگر میں بروقت یہ واضح کردوں کہ یہ ساری کشمکش اُس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کشمکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار سے نہیں لڑتا بلکہ بیماری سے لڑتا ہے اور اس کی تمام تر جدوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اگر بیمار کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے یا اس کے کسی عضو پر نشتر چلاتا ہے تو یہ تمام تر اخلاص ہوتا ہے دشمنی نہیں ہوتی۔ اس کی نفرت اور اس کا غصہ بالکلیہ مرض کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ مریض کے خلاف۔ بالکل اسی طرح اپنے ایک گمراہ بھائی کو ہدایت کی طرف لائیے۔ وہ کبھی کسی بات سے یہ محسوس نہ کرے کہ اسے تحقیر سے دیکھا جا رہا ہے یا براہِ راست اسکی ذات سے دشمنی کی جارہی ہے، بلکہ وہ آپکے اندر انسانی ہمدردی، محبت اور اخوت کو کام کرتا ہوا پائے۔

مَیں نے اجتماع دربھنگہ کے موقع پر بھی مختصراً یہ کہا تھا کہ اصلی تبلیغ تقریری اور تحریری مناظروں سے نہیں ہوا کرتی۔ یہ کام کرنے کے بہت ہی ادنےٰ طریقے ہیں۔ اصل تبلیغ یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور اور نمونہ ہوں۔ جہاں کہیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سے یہ نمونہ گذر جائے وہ آپکے طرزِ عمل سے پہچان لیں کہ یہ ہیں خدا کی راہ کے راہی۔ جس طرح کوئی "فنا فی الکانگریس" آدمی سامنے آجاتا ہے تو

کا نگر لیبیت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اسی طرح آپ ایسے فنافی الاسلام بن جائیے کہ جہاں آپ سامنے آئیں اسلامی تحریک کا پورا نقشہ واضح ہو جائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اذا رأوا ذکر اللہ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا فوراً ہو جانا چاہیے۔ یہ مقام تو تدریجاً ہی حاصل ہوگا۔ خدا کی راہ میں جب اپنے ماحول سے پیہم آپ کا تصادم ہوتا رہے گا اور آپ ہر آن، ہر لمحہ اپنے مقصد کے لئے کوشش کرتے ہوئے قربانیاں دیتے رہیں گے تو ایک مدت میں جا کر فنائیت کی کیفیت آپ پر طاری ہوگی اور آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور بن سکیں گے۔ اس مقصد کے لیے قرآن و حدیث کو بامعانِ نظر بار بار مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ اسلام کس قسم کا انسان چاہتا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرز کے آدمی تیار کیا کرتے تھے۔ وہ کیا صفات تھیں جو اس تحریک کے کارکنوں میں پہلے پیدا کی گئیں اور اسکے بعد جہاد کا علم بلند کیا گیا۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے مزکّی نے (صلی اللہ علیہ وسلم) جو انسان تیار کئے تھے انہیں ۱۵ برس کی تیاری کے بعد میدان میں لایا گیا۔ اس تیاری کی تفصیلات معلوم کیجیے اور دیکھیے کہ یہ کس تدریج کے ساتھ ہوئی تھی، اس میں کن صفات کی پرورش مقدم تھی اور کن کی مؤخر، کونسی صفات کس درجہ میں مطلوب تھیں اور انہیں کس حد تک ترقی دی گئی تھی، اور کس مقام پر پہنچکر اس جماعت سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم دنیا کا بہترین گروہ بن گئے ہو اور اس قابل ہو گئے ہو کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے لیے نکلو۔ یہی نمونہ خود اپنی تیاری کے لئے بھی آپ کے سامنے ہونا چاہیے۔

یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ میں صرف دو حدیثیں آپ کی رہنمائی کے لئے پیش کروں گا جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کام کے لیے کن صفات کے آدمی درکار ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان یعنی آدمی پورا مومن اُس وقت بنتا ہے جب اسکی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کی دوستی اور دشمنی، اور اس کا

دینا اور روکنا جو کچھ ہو خالص اللہ کے لیے ہو۔ نفسانی اور دنیوی محرکات اس کے لیے ختم ہو جائیں دوسری حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا:۔

امرنی ربی بتسع :	میرے رب نے مجھے نو چیزوں کا حکم دیا ہے
۱۔ خشیۃ اللہ فی السر والعلانیہ	کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا رہوں
۲۔ وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا	کسی پر مہربان ہوں یا کسی کے خلاف غصہ میں ہوں، دونوں حالتوں میں انصاف ہی کی بات کہوں
۳۔ والقصد فی الفقر والغنا	خواہ فقیری کی حالت میں ہوں یا امیری کی حالت میں، بہرحال راستی واعتدال پر قائم رہوں
۴۔ وان اصل من قطعنی	اور یہ کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں
۵۔ واعطی من حرمنی	اور جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں
۶۔ واعفو من ظلمنی	اور جو مجھ پر زیادتی کرے میں اسے معاف کروں
۷۔ وان یکون صمتی فکراً	اور یہ کہ میری خاموشی تفکر کی خاموشی ہو
۸۔ ونطقی ذکراً	اور میری گفتگو ذکر الٰہی کی گفتگو ہو
۹۔ ونظری عبرۃً	اور میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو

ان اوصاف مطلوبہ کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان امر بالمعروف والنھی عن المنکر یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نیکی کا حکم دوں اور بدی سے روکوں۔ معلوم ہوا کہ نیکی کو پھیلانے اور بدی کو ختم کرنے کے لیے جو امت وسط اُٹھے اسکے فرد فرد میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں۔ انہیں اوصاف کے ساتھ یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے۔ یہ نہ ہوں تو ہم کبھی اپنے منصب کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے

یہ تو شخصی اصلاح کا پروگرام ہوا۔ اس سے آگے جماعتی حیثیت سے کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے۔ جماعتی نظم کو مستحکم اور کارگر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ارکان جماعت کے درمیان محبت و ہمدردی ہو، آپس میں حسن ظن ہو، بے اعتمادی کی جگہ اعتماد ہو، آپس میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہو، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کی عادت ہو، خود آگے بڑھیں اور دوسروں کو اپنے ساتھ آگے بڑھائیں۔ یہ اوصاف ہر جماعتی نظم کے لئے ناگزیر ہیں۔ ورنہ اگر فرداً فرداً سب لوگ اعلیٰ درجہ کی صفاتِ حسنہ اپنے اندر پیدا کرلیں لیکن منظم و مربوط نہ ہوں، آپس میں متعاون نہ ہوں، شانہ سے شانہ ملا کر چل نہ سکیں تو ہم دنیا میں علمبرداران باطل کا بال تک بیکا نہیں کرسکتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شخصی حیثیت سے بہترین انسان ہم میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں اور اگر آج دنیا بھر کو ہم چیلنج دے کر کہیں کہ ایسے لوگ کسی کے پاس نہ ہونگے تو شاید اس چیلنج کا جواب کسی قوم سے نہ دیا جاسکے گا۔ مگر یہ معاملہ صرف انفرادی اصلاح کی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اپنی انفرادی اصلاح میں کمال حاصل کیا ہے انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ چند سو یا چند ہزار افراد پر اپنا اثر پھیلا دیا اور تقدس کی چند یادگاریں چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔ یہ طریقہ بڑے کام کرنے کا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا پہلوان جو بھاری بوجھ اٹھانے اور کئی کئی آدمیوں کو کشتی میں پچھاڑنے کی طاقت رکھتا ہو، ایک مربوط رجمنٹ کے مقابلہ میں بالکل بیکار ہے۔ اسی طرح اگر ہم میں سے کچھ لوگ انفرادی تزکیہ کی تمام منازل طے کئے ہوئے ہوں لیکن ان میں اجتماعی رابطہ اور تعاون نہ ہو تو ان کی حیثیت اسی پہلوان کی سی ہے جو کسی رجمنٹ کا عضو بن کر کام نہیں کرتا بلکہ منفرداً ایک رجمنٹ کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے۔ انفرادی تزکیہ کے لحاظ سے ہماری اپنی جماعت میں بھی ایسے رفقاء کی کمی نہیں ہے جن کی حالت پر خود مجھے رشک آتا ہے مگر جہاں تک جماعتی تزکیہ کا تعلق ہے، حالات افسوسناک ہیں۔ میں مستقبل قریب میں اس مسئلہ پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ جماعتی حیثیت سے کیا کچھ ترک کردینے کے قابل ہے اور اسکی جگہ کیا کیا چیزیں مطلوب ہیں۔

قرآن میں اس مسئلہ پر اصولی حد تک مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور حدیث میں اصول کی تکمیل تشریحات موجود ہیں۔ پھر سیرت نبوی اور سیر الصحابہ کے مطالعہ سے مطلوبہ اجتماعی اخلاق کے عملی نمونے بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ ان چیزوں کی ورق گردانی کیجئے اور ناپ تول کر دیکھئے کہ کس پہلو سے ہمارے اجتماعی نظم میں کیا اور کتنی کمی ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کی فکر کیجئے

صاف بات ہے کہ اجتماعی نظم میں ایک فرد کو دوسرے افراد سے لامحالہ سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر حسنِ ظن، ہمدردی، ایثار اور رواداری نہ ہو تو مزاجوں کا اختلاف تعاون کو چار دن بھی جاری نہیں رہنے دیگا۔ جماعتی نظم چلتا ہی اس اصول پر ہے کہ دوسروں کے لئے آپ اپنا کچھ چھوڑیں اور دوسرے آپ کے لئے کچھ چھوڑیں۔ اس ایثار کی ہمت نہ ہو تو کسی انقلاب کا نام بھی زبان پر نہ لانا چاہئیے

تیسری قسم کی صفات وہ ہیں جو مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لوازم میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا بھی قرآن و حدیث میں مفصل تذکرہ موجود ہے۔ صرف تذکرہ ہی نہیں، ایک ایک مطلوبہ صفت کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ وہ کس نوعیت اور کس درجہ کی ہونی چاہئیے۔ اس سلسلہ میں احکام و ہدایات کو جمع کیجئے اور سمجھئے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لئے کیا کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ میں مختصراً ان کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلی صفت جس پر زور دیا گیا ہے، صبر ہے۔ صبر کے بغیر خدا کی راہ میں کیا کسی راہ میں بھی مجاہدہ نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی راہ میں اور قسم کا صبر مطلوب ہے اور دنیا کے لیے مجاہدہ کرتے ہوئے اور قسم کا صبر درکار ہے، مگر بہر حال صبر ہے ناگزیر۔ صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جلد بازی سے شدید اجتناب کیا جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی راہ میں جد وجہد کرتے ہوئے دشواریوں اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلہ میں استقامت دکھائی جائے اور قدم پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوششوں کا کوئی نتیجہ اگر جلدی حاصل نہ ہو تب

بھی ہمت نہ ہاری جائے اور پیہم سعی جاری رکھی جائے۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ مقصد کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرات، نقصانات اور خوف اور طمع کے مواقع بھی اگر پیش آجائیں تو قدم کو لغزش نہ ہونے پائے۔ اور یہ بھی صبر ہی کا ایک شعبہ ہے کہ اشتعال جذبات کے سخت سے سخت مواقع پر بھی آدمی اپنے ذہن کا توازن نہ کھوئے، جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائے، ہمیشہ سکون، صحتِ عقل اور ٹھنڈے دل اور ٹھنڈی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرے۔ پھر حکم صرف صبر ہی کا نہیں مصابرت کا بھی ہے، یعنی مخالف طاقتیں اپنے باطل مقاصد کے لئے جس صبر کے ساتھ ڈٹ کر سعی کر رہی ہیں اسی صبر کے ساتھ آپ بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اسی لیے "اصبروا" کے ساتھ "صابروا" کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ جن لوگوں کے مقابلہ میں آپ حق کی علمبرداری کے لیے اٹھنے کا داعیہ رکھتے ہیں ان کے صبر کا اپنے صبر سے موازنہ کیجیے اور سوچیے کہ آپ کے صبر کا کیا تناسب ہے۔ شاید ہم انکے مقابلہ میں ۱۰ فیصدی کا دعویٰ کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ باطل کے غلبہ کے لئے جو صبر وہ دکھا رہے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے موجودہ جنگ کے حالات پر نظر ڈالیے۔ کس طرح وقت آپڑنے پر ان لوگوں نے اپنے ان کارخانوں، شہروں اور ریلوے سٹیشنوں کو اپنے ہاتھوں سے پھونک ڈالا جن کی تعمیر و تیاری میں سالوں کی محنتیں اور بے شمار روپیہ صرف کیا گیا تھا۔ یہ ان ٹینکوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو فوجوں کو اپنے آہنی پہیوں تلے کچل ڈالتے ہیں۔ یہ دشمن کے ان بمبار طیاروں کے حملے میں استقامت سے کھڑے رہتے ہیں جو موت کے پر لگا کر اڑتے ہیں۔ جب تک انکے مقابلہ میں ہمارا صبر ۵۰۔ ۱۰ فیصدی کے تناسب پر نہ پہنچ جائے ان سے کوئی ٹکر لینے کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔ جب سر و سامان کے لحاظ سے ہم ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو پھر سر و سامان کی کمی کو صبر ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

دوسری چیز جو مجاہدہ کا لازمہ ہے، ایثار کی صفت ہے۔ وقت کا ایثار، محنتوں کا ایثار اور

مال کا ایثار! ایثار کے اعتبار سے بھی باطل کا جھنڈا اٹھانے والی طاقتوں کے مقابلہ میں ہم بہت ہی پیچھے ہیں۔ حالانکہ بے سروسامانی کی تلافی کے لیے ہمیں ایثار میں بھی ان سے میلوں آگے ہونا چاہئے مگر یہاں صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص بیس، پچاس، سو اور ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے عوض اپنی پوری صلاحیتیں خود اپنے دشمن کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس طرح ہماری قوم کا کار آمد جوہر بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ دماغی صلاحیتیں رکھنے والا طبقہ اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ ایک بڑی آمدنی کو چھوڑ کر یہاں محض بقدرِ ضرورت قلیل معاوضہ پر اپنی خدمات پیش کر دے۔ پھر فرمایئے کہ اگر یہ لوگ اتنا ایثار بھی نہ کرینگے اور اس راہ میں پتہ مار کر کام نہ کرینگے تو پھر اسلامی تحریک کیسے پھل پھول سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی تحریک محض والنٹیروں کے بل پر نہیں چل سکتی۔ جماعتی نظم میں والنٹیروں کو اسی درجہ کی اہمیت حاصل ہے جیسی ایک آدمی کے نظامِ جسمانی میں ہاتھ اور پاؤں کو ہے۔ یہ ہاتھ اور پاؤں اور دوسرے اعضاء کس کام کے ہو سکتے ہیں اگر ان سے کام لینے کے لیے دھڑکنے والے دل اور سوچنے والے دماغ موجود نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں والنٹیروں سے کام لینے کے لیے اعلیٰ درجے کے جنرل چاہئیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جن کے پاس دل اور دماغ کی قوتیں ہیں وہ دنیوی ترقیوں کے دلدادہ ہیں اور مارکیٹ میں اسی کی طرف جاتے ہیں جو زیادہ قیمت پیش کرے۔ نصب العین سے ہماری قوم کے بہترین افراد کی وابستگی ابھی اس درجہ کی نہیں ہے کہ وہ اسکی خاطر اپنے منافع کو بلکہ منافع کے امکانات تک کو قربان کر سکیں۔ اِس ایثار کو لے کر اگر آپ یہ توقع کریں کہ وہ مفسدینِ عالم جو روزانہ کروڑوں روپیہ اور لاکھوں جانوں کا ایثار کر رہے ہیں ہم سے کبھی شکست کھا سکتے ہیں تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لئے تیسری صفت دل کی لگن ہے۔ محض دماغی طور پر ہی کسی شخص کا اس تحریک کو سمجھ لینا اور اس پر صرف عقلاً مطمئن ہو جانا، یہ اس راہ میں اقدام کے لئے صرف ایک ابتدائی قدم ہے۔ لیکن اتنے سے تاثر سے کام چل نہیں سکتا۔ یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں ایک

آگ بھڑک اُٹھے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم اُتنی آگ تو شعلہ زن ہو جانی چاہئے جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہو جاتی ہے اور آپکو کھینچکر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے، یا اتنی جتنی گھر میں غلّہ نہ پاکر بھڑکتی ہے اور آدمی کو تگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہئے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دُھن میں لگائے رکھے، دل و دماغ کو یکسو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپکی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ انکی طرف کھچیں۔ کوشش کیجئے کہ اپنی ذات کے لیے آپ قوت اور وقت کا کم سے کم حصہ صرف کریں اور آپکی زیادہ سے زیادہ جدوجہد اپنے مقصدِ حیات کے لئے ہو۔ جب تک یہ دل کی لگن نہ ہوگی اور آپ ہمہ تن اپنے آپ کو اس کام میں جھونک نہ دینگے، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہ بنے گا۔ بیشتر لوگ دماغی طور پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو دل کی لگن کے ساتھ تن من دھن سے اس کام میں شریک ہوں۔ میرے ایک قریبی رفیق نے جن سے میرے ذاتی اور جماعتی تعلقات بہت گہرے ہیں، حال ہی میں دو برس کی رفاقت کے بعد مجھ سے یہ اعتراف کیا کہ اب تک میں محض دماغی اطمینان کی بنا پر شریکِ جماعت تھا مگر اب یہ چیز دل میں اُتر گئی ہے اور اس نے نہاں خانۂ روح پر قبضہ جما لیا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ہر شخص اسی طرح اپنے اوپر خود تنقید کرکے دیکھے کہ کیا ابھی تک وہ اس جماعت کا محض ایک دماغی رکن ہے یا اسکے دل میں مقصد کے عشق کی آگ مشتعل ہو چکی ہے۔ پھر اگر دل کی لگن اپنے اندر نہ محسوس ہو تو اسے پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔ جہاں دل کی لگن ہوتی ہے وہاں کسی ٹھیلنے اور اُکسانے والے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے یہ صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہو سکتی کہ اگر کہیں جماعت کا ایک کارکن پیچھے ہٹ گیا یا نقلِ مقام پر مجبور ہو گیا تو وہاں کا سارا کام ہی چوپٹ ہو گیا۔ بخلاف اسکے پھر تو ہر شخص اُس طرح کام کریگا جس طرح وہ اپنے بچے کو بیمار پاکر کیا کرتا ہے۔

خدانخواستہ اگر آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ اسکی زندگی و موت کے سوال کو بالکلیہ کسی دوسرے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ ممکن نہیں کہ آپ یہ عذر کر کے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ بیٹھیں کہ کوئی تیمار دار نہیں، کوئی دوا لانے والا نہیں، کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے والا نہیں۔ اگر کوئی نہ ہو تو آپ خود سب کچھ بنیں گے کیونکہ بچہ کسی دوسرے کا نہیں آپ کا اپنا ہے۔ سوتیلا باپ تو بچے کو مرنے کے لئے چھوڑ بھی سکتا ہے مگر حقیقی باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دے گا۔ اسکے تو دل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کام سے بھی اگر آپ کا قلبی تعلق ہو تو اس کو آپ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے، اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی نااہلی یا غلط روی یا بے توجہی کو بہانہ بنا کر آپ اسے مرجانے دیں اور اپنے دوسرے مشاغل میں جا کر منہمک ہو جائیں۔ یہ سب باتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ خدا کے دین اور اس کی اقامت و سربلندی کے مقصد سے آپ کا رشتہ محض ایک سوتیلا رشتہ ہے۔ حقیقی رشتہ ہو تو آپ میں سے ہر شخص اس راہ میں اپنی جان لڑا کر کام کرے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر آپ اس راہ میں کم از کم اُتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا آپ اپنے بیوی بچوں سے رکھتے ہیں تو انجام پسپائی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور یہ ایسی بری پسپائی ہوگی کہ مدتوں تک ہماری نسلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرأت بھی نہ کر سکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے سے پہلے اپنی قوتِ قلب کا اور اپنی اخلاقی طاقت کا جائزہ لیجئے، اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لئے جس دل گردے کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجئے۔

چوتھی ضروری صفت اس راہ میں یہ ہے کہ ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور منضبط (SYSTEMATIC) طریقہ سے کام کرنے کی عادت ہو۔ ایک مدت دراز سے ہماری قوم اس طریقِ کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہو جائے۔ جو قدم اُٹھایا جائے ہنگامہ آرائی اس میں ضرور ہو، چاہے مہینہ دو مہینہ میں سب کیا کرایا غارت ہو کے رہ جائے۔ اس عادت کو ہمیں بدلنا ہے۔ اسکی جگہ بتدریج اور بے ہنگامہ کام کرنے کی مشق ہونی چاہئے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی، جو بجائے خود ضروری ہو، اگر آپکے

سپرد کر دیا جائے تو بغیر کسی نمایاں اور معجل نتیجہ کے اور بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی کام میں کھپا دیں ۔ مجاہدہ فی سبیل اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں رہا کرتا ہے اور نہ ہر شخص اگلی ہی صفوں میں لڑ سکتا ہے ۔ ایک وقت کی میدان آرائی کے لیے بسا اوقات پچیس پچیس سال تک لگاتار خاموش تیاری کرنی پڑتی ہے اور اگلی صفوں میں اگر ہزاروں آدمی لڑتے ہیں تو ان کے پیچھے لاکھوں آدمی جنگی ضروریات کے اُن چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بین نظر میں بہت حقیر ہوتے ہیں ۔

تقریر کو ختم کرنے سے پہلے مختصراً میں اس امر کی تشریح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اب ہمارے سامنے پروگرام کیا ہے ۔ مجھے شبہ ہے کہ جس پروگرام پر میں تحریک کو چلا رہا ہوں اسے سمجھا نہیں گیا سب سے پہلا کام جس کے لیے یہ اجتماعات منعقد کیے جا رہے ہیں یہ ہے کہ آپ میں سے ہر شخص سے مجھے شخصاً واقفیت ہو جائے ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ میرے ساتھ کن کن اوصاف کے لوگ چل رہے ہیں، ان میں کیا کیا صلاحیتیں اور قوتیں ہیں اور ان سے کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے ۔ آپ حضرات نہایت وضاحت سے مجھے بتایئے کہ کس موقع پر آپ کیا کیا خدمات سرانجام دے سکتے ہیں ۔ جس قدر جلدی میں یہ معلومات حاصل کر لوں گا اسی قدر جلدی کام کا نقشہ تیار کر سکوں گا ۔ قوت کے اندازہ کے بغیر کوئی اقدام کرنا میرے نزدیک مستحسن نہیں ہے ۔ اس غرض کے لیے آپ حضرات بار بار مرکز میں آتے رہیں، خط و کتابت سے مجھے معلومات فراہم کرتے رہیں اور جہاں تک ممکن ہوگا میں خود بھی اجتماعات میں شرکت کر کے آپ سے انفرادی رابطہ کو ترقی دیتا رہوں گا ۔ اس کے بعد میں ایک مکمل نقشہ کار مرتب کر کے تدریجاً آگے بڑھنے کی فکر کروں گا ۔

دوسرا ضروری کام یہ سامنے ہے کہ ہمیں تربیت اشخاص کے لیے ایک ایسی مشینری بنانی ہے جس کے ذریعے سے ہم ضرورت کے آدمی تیار کریں اور اپنے کارکنوں میں ضروری اوصاف پیدا کریں ۔ کل جو تجاویز پیش ہونے والی ہیں ان سے آپکو معلوم ہو جائے گا کہ اس سلسلہ میں ہم بہت جلدی اقدام

کرنے والے ہیں۔

تیسرا کام جس پر بہت دنوں سے بالمشافہہ بھی اور خط وکتابت کے ذریعہ سے بھی مجھے بار بار توجہ دلائی جارہی ہے اور جس کی شدید اہمیت کو میں خود بھی محسوس کررہا ہوں، یہ ہے کہ نئی نسلوں کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تحریک کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ اب تک سرمایہ اور مناسب کارکنوں کی کمی اور جنگ کی پیدا کردہ معاشی مشکلات اس راہ کی رکاوٹ بنی رہی ہیں، لیکن شاید اس سلسلہ میں اب بہت زیادہ تعویق نہ ہوگی اور عنقریب آپ سنیں گے کہ مرکز میں اس کام کی بنا ڈال دی گئی ہے۔ چنانچہ میں یہ خوشخبری بھی سنا دوں کہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اسی غرض کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں اور عجب نہیں کہ مستقلاً یہیں رہ جائیں۔

چوتھی چیز جس کے لیے ہمیں سر جوڑ کر سوچنا ہے، یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے ساتھ لے چلنے کے لیے کیا صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اب تک ہمارا ایک ہی ہاتھ کام کرتا رہا ہے اور گاڑی کا ایک ہی پہیہ متحرک ہوا ہے۔ اب ہمیں اپنے دوسرے ہاتھ اور اپنی گاڑی کے دوسرے پہیہ کی فکر کرنی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارا اور ہماری عورتوں کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور وہ ہم سے اور ہم ان سے ہر لحظ متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اگر ہم ان کی اصلاح کی فکر نہ کریں گے تو خود ہماری اصلاح بھی نامکمل رہے گی۔ ہم گھروں کو مسلمان بنائے بغیر دنیا کو مسلمان نہیں بنا سکیں گے۔ اس معاملہ میں ساری دقت یہ ہے کہ عورتوں سے ہم وسیع پیمانے پر براہِ راست ربط نہیں پیدا کرسکتے۔ اس کے لیے خود عورتوں ہی سے مدد لینی پڑے گی۔ جو قومیں کوئی شرعی ضابطہ نہیں رکھتیں ان کا معاملہ آسان ہے۔ وہ اپنی سیاسی اور تمدنی تحریکات کے لیے اپنی عورتوں کو بازاروں، کارخانوں، پنڈالوں اور مدرسوں میں بے تکلفی سے لاسکتی ہیں۔ مگر ہمارے لئے یہ ایک نازک مسئلہ ہے اور اسے حل کرنے کے لئے مغز زنی کی ضرورت ہے۔

پانچواں کام یہ سامنے ہے کہ رائے عام کو جذب کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر منظم کوشش کی جائے۔

اب تک ہم نے لوگوں کو براہِ راست مخاطب نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہم اس سمندر کے محض ایک ذرا سے گوشے میں کچھ ہلچل پیدا کر سکے ہیں۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ اصل سمندر کی طرف بڑھنا ہے ضروری نہیں کہ عوام پورے کے پورے ہمارے رکن بن جائیں۔ ہمارے مدعا کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ باشندگانِ ملک کی ایک کثیر تعداد حق کو حق مان لے، ہمارے مقصد کی صحت کی معترف ہو جائے اور ہمارا اخلاقی اثر اس پر قائم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آگے چل کر ہم جو قدم اُٹھائیں گے اس میں عوام کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہونگی۔ اب تک ہم نے اپنے لٹریچر میں مسائل زندگی کے بہت تھوڑے حصے سے تعرض کیا ہے اور وہ بھی زیادہ تر مجمل اشارات کی صورت میں ہے حالانکہ اِس دَور میں زندگی کے ہر پہلو پر ہمیں اپنے نقطۂ نظر سے تفصیلی روشنی ڈالنی چاہیے، علوم کی تدوین جدید کرنی چاہیے اور یہ کام ایک دو زبانوں میں نہیں متعدد زبانوں میں کرنا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہمارے مدعا کو سمجھیں۔ چنانچہ اب ہمیں اس میدان میں بھی اپنی مساعی کے دائرے کو وسیع کرنا ہے۔ پھر ابھی تک ہم نے نشر و اشاعت کے لیے صرف تحریر کے ذریعہ پر انحصار کیا ہے۔ تقریر سے ہم نے ابھی کوئی کام نہیں لیا ہے۔ اب ہمیں اس میدان کی طرف بھی بڑھنا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم تقریر کا نیا ڈھنگ اختیار کریں، نمائشی اور ہنگامی اسٹیج سے دُور رہیں، اور ذمہ دارانہ گفتگو کی عادت ڈالیں تاکہ جو آواز بھی ہماری طرف سے بلند ہو وہ متین، باوقعت، وزن دار اور ممتاز ہو کہ لوگ اس کو اُن بہت سے سُروں میں سے ایک سُر نہ سمجھیں جو ہنگامہ پرور اور بے لگام مقررین کے سازوں سے نکل رہے ہیں۔ مَیں نے اب تک اپنے رفقاء کو تقریر سے اسی لئے روک رکھا ہے کہ پُرانی عادات کا اثر ابھی تک باقی ہے، ڈرتا ہوں کہ کہیں اسی پرانے انداز کی تقریریں ہم بھی نہ کرنے لگیں جو نظامِ اسلامی کا نام لینے والوں کے منہ کو زیب نہیں دیتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نشرِ افکار کے تمام ذرائع کو استعمال کریں مگر پہلی شرط یہ ہے کہ انہیں اخلاق اسلامی کا پابند بنائیں اور ان غیر صالح عناصر سے انہیں پاک کریں جو شترِ بے مہار قسم کے لوگوں نے ان میں ملادیے ہیں۔

یہ چند ضروری باتیں تھیں جو میں آپ کے گوش گزار کر دینا چاہتا تھا۔ آپ ان پر غور کریں اور مفید مشوروں سے میری مدد کریں۔ اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالٰے ہمیں اپنے عہد کی ذمہ داریاں سمجھنے اور ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری نیتوں میں خلوص اور ہمارے ایمان کو طاقت بخشے۔ ہماری مساعی میں برکت دے۔ ہمارے تھوڑے سے عمل کو قبول کرے اور زیادہ عمل کی ہمت دے۔ اور اپنے اُن بندوں سے ہماری تائید کرے جو ہم سے بہتر صفات رکھتے ہوں اور ہم سے زیادہ بہتر طریقہ سے دین کی خدمت کر سکتے ہوں ؟

دوسری نشست :۔ ۲۷ مارچ (۹ بجے صبح تا ۱۲ بجے دوپہر)

پروگرام کے مطابق دوسری نشست جماعتوں کی مقامی کارگزاری کی رپورٹیں سنانے کے لئے مخصوص تھی۔ چنانچہ مختلف جماعتوں کے نمائندوں نے تفصیلاً اپنے کام اور اپنی مشکلات کو حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ امیرِ جماعت نے کارگذاریوں کے اشتہار و اعلان کی جو ممانعت کر رکھی ہے اسے ختم کر دیا گیا۔ نہیں، وہ بندش بدستور باقی ہے۔ اور اسے باقی رکھتے ہوئے رپورٹیں صرف اس لیے عام مجمع میں سنوائی گئیں کہ مختلف ارکان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کہاں کہاں کس نوعیت کا کام کس طرز پر ہو رہا ہے اور اسکے مقابلہ میں کہاں کے لوگ کتنے پیچھے ہیں۔ کیا کیا مشکلات مختلف اصحاب کو پیش آرہی ہیں اور انہیں کس کس طرح حل کیا جا رہا ہے۔ اس مدعا کو جناب امیر نے مختصر سی تقریر میں خوب واضح کر دیا۔ آخر میں جب جملہ مقامی جماعتوں کی رپورٹیں سُنائی جا چکیں تو جناب امیر کے ایما سے مولنا امین احسن صاحب اصلاحی نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے بہت ہی مفید ہدایات اور مشورے دئے۔ انکی تقریر کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے

تقریر جناب مولنا امین احسن صاحب اصلاحی

حاضرین! میں آپ کی رپورٹیں سننے میں ایسا منہمک رہا کہ مجھے ان رپورٹوں کے مختلف پہلوؤں پر

اتنا غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا جتنا کہ ان پر تبصرہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ تاہم کچھ باتیں مجھے کھٹکتی رہی ہیں اور ان کے متعلق امیر کے حکم سے کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک آپ کی کارگزاریوں اور بیان کردہ واقعات وحالات کا تعلق ہے، ان پر تبصرہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے مگر جہاں تک دوسری جماعتوں سے تعلق و تصادم کا معاملہ ہے، اس میں اصلاح کی بڑی گنجائش ہے اور میں اسی پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

آپ حضرات نے جن مشکلات کو پیش کیا ہے ان کا سامنا تو اس راہ میں ناگزیر ہے۔ مگر ہم کو ان کا صحیح علاج سوچنے سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ صحیح طرز پر حق کا کام کرنے والوں کو مزاحمتوں سے تو بہر حال دوچار ہونا ہی ہے مگر اس مرحلہ پر یہ طرزِ عمل تو قطعاً غلط ہے کہ دوسروں سے خواہ مخواہ تصادم پیدا کیا جائے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں اگر چند ضروری امور کا اہتمام کیا جائے تو ہماری راہ کے کانٹے بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز جس پر میں نے آج بھی اور پہلے بھی بہت غور و خوض کیا ہے اور جو بہت ہی مشکل معلوم ہوتی ہے، نہایت درجہ سنجیدہ توجہ چاہتی ہے۔ میری مراد حق کو جماعت سے باہر کے لوگوں تک پہنچانے کا مسئلہ ہے۔ دوسری جماعتوں سے ہمیں اسکے سوا کچھ مطلوب نہیں ہے کہ وہ حق کو صاف صاف پہچان جائیں۔ یاد رکھیئے کہ یہ کام محض قول سے پورا نہ ہو سکے گا۔ اس کے لئے ہمیں اپنے انفرادی اعمال اور اجتماعی کردار کو وسیلہ بنانا پڑے گا۔ بجائے اسکے کہ زوردار تقریروں کا سیلاب بہایا جائے اور نظریات کی اشاعت پریس کے ذریعے سے کی جائے، ہونا یہ چاہیئے کہ اپنے عمل سے ہم یہ ثابت کر دیں کہ ہم اپنے مقصد میں مخلص ہیں اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور عالمِ انسانیت کے لئے بالعموم ایک حقیقی فائدے کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کسی سے دشمنی نہیں بلکہ دنیا کی پوری آبادی سے حقیقی ہمدردی ہے۔ آزمائش کے مختلف مواقع پر اگر ہم عمل سے یہ ثبوت بہم پہنچا دیں کہ ہماری زندگی کسی خاص گروہ یا

جماعت یا کسی قوم کے فائدے کے لیے نہیں ہے بلکہ حق کے نصب العین کے لیے ہے تو ذہنوں کو فتح کرلینے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ساتھ بے شمار مصیبتیں چمٹی ہوئی ہیں اور ان کا ایک اچھا خاصا موٹا خول خود ہمارے گرد لپٹا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ خود اپنی دعوت کی راہ کی پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ خول ہمیں جتنا جلدی ممکن ہو اُتار دینا چاہیے اور حق کو بالکل بے نقاب کرکے لوگوں کے سامنے لانا چاہیے۔ تاکہ لوگ صاف صاف پہچان لیں کہ صداقت و حقیقت کیا ہے۔ اگر ہم اپنے بیوی بچوں، اپنے احباب، اپنی جماعت اور اپنی قوم کی غلط عصبیت کی آلودگیوں سے اپنا دامن پاک کرلیں، تو اگرچہ دنیا کی زبانِ طعن کبھی بند نہیں ہوسکتی مگر ہمارے خلاف حجت و دلیل کی زبان بند ہوجائے گی۔ صرف یہی طریقہ ہے دُنیا کو انکارِ حقیقت سے روک دینے کا۔ عصبیت کی بُو بھی اگر باقی رہے گی اور حق کے سوا اپنی ذات یا کسی قوم کے تفوق کی کوئی خواہش بھی ہمارے اندر موجود رہے گی تو ہم خود اپنے لیے حجاب بنے رہیں گے اور اپنی دعوت کے راستے میں چٹان بن کر حائل رہیں گے۔ گھروں میں، بازاروں میں، جلسوں میں، خانقاہوں اور مسجدوں میں ہر پہلو سے اپنے آپ کو ادنےٰ اغراض سے بلند تر دکھانا ناگزیر ہے۔

اس گذارش کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے آپ حضرات اسوۂ انبیا کا مطالعہ کیجیے۔ اللہ کی جانب سے جتنے داعی اللہ کے کلمے کو اونچا کرنے کے لیے آئے ان میں سے ہر ایک نے رشتۂ حق کے سوا ہر رشتے کو توڑ دیا۔ حمیت جاہلیت کے سارے بندھن کاٹ ڈالے، تعصبات کی موٹی موٹی زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی دعوت بغیر کسی فرق و امتیاز کے ہر حق آشنا دل کو اپیل کرتی اور جو لوگ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ان کے سینوں میں گروہوں اور جماعتوں کی برتری کے بجائے انسانیت کی خدمت کا جذبہ مشتعل ہوجاتا۔ اگر انہی داعیانِ ہدایت کے اُسوہ کا اتباع کیا جائے تو ہماری تبلیغی مشکلات معاً حل ہوجاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اگرچہ جماعت کے لٹریچر میں ضروری امور بیان کردیے گئے ہیں، مگر کوئی مفصل پروگرام کام کا ابھی

ہم نہیں بنا سکے ہیں۔ میں یہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں عرض کر سکتا کہ اپنی پرائیویٹ اور پبلک زندگی میں یہ ثابت کر دینے کی فکر کیجیے کہ آپ کی ساری مساعی صرف اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے ہیں۔ حنفیت اور وہابیت کے جھگڑوں اور گروہوں اور جماعتوں کی بدگمانیوں کو ختم کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ہمیں کوئی نئی جماعت نہیں بنانی ہے ہمارا مقصد صرف حق کو واضح کر دینا ہے۔

ایک اور چیز جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ تعلی اور گھمنڈ جو ایک حقیقت کو پا لینے یا ایک علم کو حاصل کر لینے سے آدمی میں پیدا ہو جاتا ہے ایک داعی حق کے لیے سب سے بڑا حجاب ہے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں دوسروں سے کچھ اوپر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کی راہ میں خود روک بن کر کھڑا ہو جاتا ہے بعض لوگ اس کبر کو ذرا زیادہ صفائی سے چھپا لیتے ہیں مگر دل میں یہ فتنہ موجود ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی گفتگوؤں اور تحریروں میں ایک بناوٹ سی آجاتی ہے اور بناوٹ دعوتِ حق کے ساتھ کوئی خفیف سا ربط بھی نہیں رکھتی۔ تعلی اور تکبّر کے مظاہرہ سے لوگ بدک جاتے ہیں اور اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔ اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ آپ اس انکشاف حق کو جو آپ پر ہوا ہے اللہ کے فضل کا نتیجہ سمجھیں اور اس پر اس کے شکر گزار ہوں۔ یہ احساس آپ میں کبر کی جگہ تواضع کا جذبہ پیدا کرے گا اور بندگانِ خدا کے ساتھ آپ کے تعلق کو مضبوط کر دے گا۔ جہاں خدا کی عنایات کا احساس آدمی میں پیدا ہو جاتا ہے، وہاں خود بخود تکبر کی جگہ تواضع، غضب کی جگہ ہمدردی اور بغض کی جگہ محبت کے جذبات نشوونما پانے لگتے ہیں۔ داعی حق کو عوام سے ویسی ہی گہری اور قلبی محبت ہونی چاہیے جیسی ایک بچے کے لیے ماں اور باپ میں پائی جاتی ہے۔ اسے لوگوں کی غلطیوں سے مزا لینے کے بجائے کوفت ہوتی ہے، احتساب کی جگہ اس میں دردمندی پیدا ہوتی ہے، غرور و کبر کی جگہ اس میں ایک ہمدردانہ اضطراب رونما ہوتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اس کے لب و لہجہ میں بھی وہ سوز پیدا ہو جاتا ہے جس سے پتھر کی طرح سخت دل بھی موم کی طرح نرم ہو جاتے ہیں۔

میں نے رپورٹوں کو سُنکر یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے رفقا مخالف جماعتوں پر انہیں الفاظ میں چوٹیں کرتے ہیں جو مدتوں سے ہماری زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہم اپنے مخالفین کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی طرح لذت لیتے ہیں جس طرح دوسری جماعتیں اپنے حریفوں کی تحقیر سے لذت لیتی ہیں۔ بکثرت ایسے لوگ بھی ہم میں موجود ہیں جو جلوت میں چاہے محتاط ہوں مگر خلوت میں وہ بھی ایک حد تک دوسروں پر طعن د طنز سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس قسم کی ریاکاری سے وہ روح کبھی نشوونما نہیں پاسکتی جس کا نام خلوص ہے، اور خلوص کے بغیر دعوتِ حق کو دوسروں کے دل و دماغ میں اُتارنا ناممکن ہے۔

اصل میں جب ہم سوچتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے جانا ہے وہ دوسروں کو نہیں معلوم ہے، اور پھر یہ خیال کرتے ہیں کہ آخر اتنی بدیہی بات دوسرے کیوں نہیں سمجھتے تو ہمارے اندر کچھ قائدانہ اور کچھ معلمانہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہم دوسروں کو اسی طرح ملامت اور سزا کا مستحق خیال کرنے لگتے ہیں جس طرح ایک معلّم اپنے شاگرد کو اس کی ہر غلطی پر گوشمالی کا مستحق سمجھتا ہے۔ لیکن تعلیم پر غور کرنے والے اصحاب سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ یہ طریقِ تعلیم سرے سے غلط ہے۔ اگر تعلیم کو دلوں میں اتارنا مقصود ہے تو غضب، طنز و تعریض، درشت زبانی اور تلخ گفتاری کے ہتھیار کھول ڈالیے۔ آپ کسی سے لڑنے نہیں جارہے ہیں، تعلیم و تبلیغ کی مہم درپیش ہے اور اس مہم کے لیے دل سوزی، ہمدردی اور احساسِ اخوّت کے اسلحہ ہی مفید ہو سکتے ہیں۔
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کونسا گذرا ہے۔ ارشاد ہوا، طائف کا دن! اس روز دنیا کا سب سے بڑا انسان پتھروں کی باڑھ کا نشانہ بنتا ہوا ایک باغ کی ٹٹی کی پناہ لیتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ ان ظالموں کے حق میں بددعا کیجیے تو وہ بددعا کرنے کے بجائے اہلِ طائف کے لیے ہدایت کی دعا کرتا ہے۔ یہ اسپرٹ پیدا کئے بغیر اور کام تو شاید ہو سکتے ہیں لیکن حق کا کام نہیں ہو سکتا۔ لوگ اگر حق کے مزے سے واقف نہیں ہیں، صداقت کی خوشبو سے محروم ہیں تو وہ غضب کے نہیں ہمدردی کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ ہم بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ حق کو پہچانے

کی سعادت سے محروم ہیں مگر اس پر یہ کیسے جائز ہو گیا کہ ان سے بے رحمی اور غرور کا برتاؤ کیا جائے۔ ہماری کوشش دورانِ تبلیغ میں یہ ہونی چاہئے کہ لوگ یہ محسوس نہ کریں کہ انہیں گھسیٹ کر یا ہانک کر کسی طرف لایا جا رہا ہے بلکہ یہ سمجھیں کہ وہ خود بخود ایک حقیقت تک پہنچے ہیں۔ اصولی مسلّمات پر تمام مسلمان جماعتیں متفق ہیں اور اگر نرمی، حلم اور برادرانہ محبت سے کام لیا جائے تو آسانی سے ان تمام جماعتوں میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یاد رہے یہ کام مناظرہ بازی اور دماغی فتح کی خواہش کے ساتھ چل نہیں سکتا۔ یہی خواہش تو انسان کو تعصب اور تشدد پر آمادہ کرتی ہے۔

آپ حضرات اپنی تقریروں اور گفتگوؤں میں جونہی اس خواہش کا اثر محسوس کریں وہیں اپنے نفس کی باگ کھینچ لیں اور اگر مخاطب کی طرف سے اس کا مظاہرہ ہو تو "قَالُوْا سَلٰمًا" کا طریقہ اختیار کریں۔ تبادلہ خیالات کے دوران میں ہار جیت کا کبھی سوال ہی نہیں پیدا ہونا چاہئے۔ داعی کا مقام ان چیزوں سے بہت اونچا ہے۔ اسے تو صرف کلمۂ حق کے چند بیج ذہنوں میں ڈالنے ہیں اور پھر دماغی کھیتیوں کی رکھوالی کرنی ہے۔ کبھی یہ خیال بھی دل میں نہ آنے دیجئے کہ ہماری بات رہ جائے۔ یہی خیال اصطلاحی مناظرہ کی روح ہے۔ اسی کی مشق ہم سالہا سال سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اب پوری قوت کے ساتھ اس عادت کی جڑیں اکھاڑنی ہیں۔ اب ہمیں مناظروں میں جیتنے کے بجائے ہارنے اور بار بار ہارنے کی مشق بہم پہنچانی ہے جہاں گفتگو سے خلوص کی روح رخصت ہونے لگے وہیں زبان پر قفل چڑھا لیجئے اور کچھ پروا نہ کیجئے کہ اس پر تالی پٹ جائے گی۔ زبان کی ہر لغزش پر بے تکلفی سے مخاطب سے معافی طلب کیجئے اور اس سے بے نیاز ہو جائیے کہ آپ پر آوازے کسے جائیں گے۔ ان شکستوں کو اگر سہنے کی ہمت ہو تو آگے آئیے اور کام کیجئے ورنہ اگر مناظرانہ ہتھکنڈوں سے کسی کو آپ کھینچ لائے بھی تو وہ جس راستہ سے آیا ہے اسی راستہ سے ایک دن واپس بھی ہو جائے گا۔

اگر اس معاملہ میں آپ انبیاء کے طریقِ کار پر غور و خوض کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کی چند خصوصیات

ہیں ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی موجودہ جماعتوں میں سے ہماری جماعت نبیوں کے طریق کار کی پیروی کا عزم لے کر اٹھی ہے۔ پس ہمیں براہِ راست وہیں سے روشنی حاصل کر لی ہے۔ تو آپ جانتے ہیں کہ جب کبھی کوئی نبی آیا تو اس نے اپنی قوم کو یوں مخاطب نہیں کیا کہ "اے کافرو! ایمان لاؤ" یا "اے گمراہو! سیدھی راہ پر آجاؤ" بلکہ محبت آمیز انداز میں "یا قوم"، "یا ایھا الناس" اور "یا اھل الکتٰب" کے الفاظ سے انہیں مخاطب کیا۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ ان کے ساتھ ہوئے انہوں نے جب ایمانی کمزوریاں دکھائیں اور انہیں تنبیہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انہیں بھی یوں نہیں مخاطب کیا کہ "اے منافقو! یا اے بدعہدو! اپنی روش کو بدلو!" بلکہ انہیں "یا ایھا الذین اٰمنوا" کہہ کر پکارا۔ پھر جو لوگ ان دعاۃ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تو انہوں نے بھی اپنے طرزِ خطاب کو حلم، محبت اور نرمی کی حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

پھر آگے چل کر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ ایک صالح و مصلح جماعت اپنے قول و عمل سے حق کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہے اور حق کا چہرہ گرد و غبار سے صاف ہو کر لوگوں کو نظر آنے لگتا ہے۔ اس موقع پر حق کو کھلم کھلا دیکھنے کے باوجود جو لوگ مکابرت، ضد یا تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دلائل کا ترکش خالی ہو جانے کے بعد بھی انکار کی روش جاری رہتی ہے تو پھر نبی کا طرزِ خطاب بدل جاتا ہے۔ پھر وہ سرکشوں کو صاف الفاظ میں "یا ایھا الکٰفرون" کہہ کر پکارتا ہے اور اپنی قوم سے الگ ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے پہلے مدتِ مدید تک وہ ملاطفت سے ہی دعوت دیتا رہتا ہے۔ نبی کریمؐ نے اپنی قوم کے ساتھ یہ روش اس وقت اختیار کی جب دعوت واضح ہو چکی تھی اور قوم کی اندھی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ انہوں نے خود اپنے کفر کا اعلان کر دیا اور نبی صلعم کے قتل کا ارادہ کر لیا۔ معترضین اس پر یہ کہا کرتے ہیں کہ درحقیقت جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت کمزور تھی تب حلم و عفو تھا مگر جب طاقت آنے لگی تو درشتی پیدا ہونے لگی۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ

ہے کہ نبی انسانوں کی کمزوریوں کا صحیح صحیح اندازہ کرتا ہے اور انہیں کمزوریوں کے پیشِ نظر وہ ان سے شفقت کا سلوک روا رکھتا ہے۔ اس کی یہ شفقت اتنی فیاضانہ ہوتی ہے کہ شریر لوگ اس کی وجہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نبی یہ سب کچھ دیکھتا ہے مگر کسی کو پیچھے نہیں پھینکتا وہ صرف عمومی انداز میں جماعت اور جماعت سے باہر کے لوگوں پر تنقید کرتا ہے: ما بال قوم یفعلون کذا وکذا (لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے) ان تنبیہات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ عدم تفقہ فی الدین کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں وہ سنبھل جاتے ہیں۔ آخر میں جا کر صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو سو فیصدی ہٹ دھرم ہونے کی وجہ سے جماعت کے نظم کو درہم برہم کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ جب ان کی طرف سے اصلاح کی ہر توقع ختم ہو جاتی ہے تو پھر نبی اپنی محنتوں کے قیمتی ثمرے یعنی اپنی جماعتِ صالحہ کو خطرے سے بچانے کے لیے "واغلظ علیھم" کے طریقہ پر مامور کیا جاتا ہے۔

آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں یہ دورِ فتن ہے۔ اس کو اپنی جن علمی روشنیوں پر ناز ہے وہ صرف دنیا کو تاریک کرنے میں معین ہو سکی ہیں۔ بلکہ انصاف یہ ہے کہ باطل کو حق اور حق کو باطل بنا کر دکھلانے کی سعی کے لحاظ سے تاریخ کا کوئی دور اس دور کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر جبکہ حق واضح اور آشکارا نہیں ہے تو دوسروں پر سخت گیری کرنے کی گنجائش کہاں ہے؟ یہ وقت "واغلظ علیھم" پر عمل کرنے کا نہیں ہے۔ ابھی تو ایک لمبا دورِ محبت و شفقت ہمیں طے کرنا ہے اور اس دور میں کسی کو پیچھے نہیں پھینکنا ہے۔ البتہ خدا اگر ہماری محدود مساعی کو قبول فرما کر ہمیں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے کوئی نظم قائم کرنے کی توفیق دے دے اور "قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" کی صبح سعادت طلوع ہو جائے تو پھر یہ روشنی کھوٹے اور کھرے، اعمیٰ اور بصیر، مومن اور منافق کو ایک دوسرے سے خود ممیز کر دے گی۔

* پچھلے عرصہ میں ہمارے رفقاء نے جہاں کہیں انبیاء کے طریقِ دعوت کو چھوڑ کر جلد بازی سے کام

لیا ہے وہاں یہ غلط فہمی پھیل گئی ہے کہ ہم خدانخواستہ مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے یہ غلط فہمی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ ہماری دعوت کی طرف سے کان بند کر لیں گے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا بڑا طبقہ صحیح شعور دینی سے محروم ہو چکا ہے اور موجودہ نظامِ طاغوت نے ان کی اس جہالت کے بڑھانے میں پورا حصہ لیا ہے ۔ اور اپنوں اور بیگانوں نے مل کر ان کو ایسے انجکشن دئے ہیں کہ ان کی قوت شامہ ماؤف ہو گئی ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ان کی قوتِ شامہ کو بیدار کریں۔ جب ان کی قوتِ شامہ بیدار ہو جائے گی تو وہ خود اپنی موجودہ حالت سے بیزاری محسوس کرنے لگیں گے اور کفر و شرک اور نفاق کی ساری غلاظتوں سے انہیں از خود نفرت ہو جائے گی۔ اس مقصد کے لئے ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو باتیں کفر و شرک ہیں ہم ان کا کفر و شرک ہونا واضح کر دیں۔ بس اس قدر کافی ہے۔ کسی مسلمان کی روح شرک کو محسوس کر لینے کے بعد اس سے دوستی نہیں رکھ سکتی۔ جس شخص میں صفائی اور طہارت کا مذاق پیدا ہو جاتا ہے وہ خود اپنے دامن کی نجاستوں کو دھونے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم نے مسلمانوں میں صحیح شعور دینی بیدار کر دیا تو وہ از خود ساری آلودگیوں سے پاک ہونے کی کوشش کریں گے۔

اس دینی شعور کو عام کرنے کی جد و جہد میں یہ لازم ہے کہ ہماری توجہ دین کے اصول پر مرکوز رہے جزئی مسائل میں نہ اُلجھے۔ دین کی اساس توحید، رسالت اور معاد کے صحیح تصوّرات و معتقدات پر قائم ہے یہ تصورات اگر ذہنوں میں اپنی ضروری تفصیلات کے ساتھ واضح ہو جائیں تو دین کا صحیح شعور پیدا ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے جزئی امور میں خود بخود اصلاح ہوتی چلی جائے گی۔ اور ہمیں ان کے لیے کوئی خاص جد و جہد نہیں کرنی پڑے گی۔ جب کسی شخص میں مذاقِ سلیم پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اسکی جائے قیام، لباس اور بدن کی ایک ایک گندگی پر توجہ دلانے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس کی زندگی کے ہر گوشہ میں خود ہی نفاست اور ستھرائی نمودار ہونے لگتی ہے

اب میں آپ کے اس سوال کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو آپ نے کیا ہے کہ کیا جزئیات سے میری مراد آمین بالجہر وغیرہ کی قسم کے مسائل ہیں؟ نہیں، یہاں جزئیات سے میری مراد آمین بالجہر اور رفع یدین وغیرہ کی قسم کے مسائل نہیں ہیں۔ ان مسائل اجتہادیہ میں تو ہمیشہ ہمیں رواداری ہی کا مسلک اختیار کرنا پڑے گا اس لیے کہ ان کے دونوں پہلوؤں کے لئے دین میں گنجائش ہے۔ میں یہاں اُن جزئیات امور سے غض بصر کا مشورہ دے رہا ہوں جن کے لئے دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن خدمتِ دین کی مصلحت مقتضی ہے کہ اپنی دعوت کے اس مرحلہ میں ہم ان سے بھی چشم پوشی کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کرینگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم شاخوں کے تراشنے میں اپنا سارا وقت برباد کر دیں گے اور فتنوں کی جڑوں کی طرف توجہ کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ ہمارا کام صحیح طور پر جب ہی ہو سکتا ہے کہ توحید اور رسالت اور معاد کے پورے پورے متعلقات اچھی طرح عوام کو سمجھا دیے جائیں۔ یہ لمبا راستہ طے کر لینے کے بعد لوگ جزئی امور میں راہِ حق کو پا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ خود محسوس کرنے لگیں گے کہ فلاں کام جو ہم کرتے ہیں وہ ہمارے عقیدۂ توحید کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، فلاں رسم جو رائج ہے ہمارے تصورِ رسالت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، اور فلاں عادت جو فروغ پائے ہوئے ہے ہمارے تصورِ معاد کے ساتھ مطابق نہیں ہے۔ بہرحال ان جزئی امور میں کسی گروہ کو سخت سست کہنا یا کسی سے مقاطعہ کرنا ہمارے کام کے لئے قطعاً مضر ہے۔ حتی الوسع ان معاملات میں چشم پوشی کیجیے۔ اگر کوئی سلیم الفطرت آدمی اس سلسلہ میں کچھ سننا گوارا کرے تو نرمی سے کہیے کہ بھائی یہ کیا چیزیں ہیں جو تم نے اختیار کر رکھی ہیں۔ پھر اگر وہ کچھ اثر لے تو بہتر ورنہ خاموش ہو جائیے۔ پر زور اصلاح اُن چیزوں کی ہونی چاہیے جن سے اصل دین پر زد پڑتی ہے۔

اصلاح کے کام میں ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ پہلے کسی اصل کے قریب ترین مقتضیات پیش کیے جائیں پھر اس سے بعید، پھر اس سے بعید تر۔ مثلاً توحید کے متعلقات میں سے سب سے پہلے وہ چیزیں لینی چاہئیں

جن پر عموماً سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ پھر آگے چل کر ان ضمنی امور کی وضاحت کیجیے جو اولیاتِ توحید سے مستنبط ہوتی ہیں۔ پھر اور آگے چلیے اور ان آخری مقتضیاتِ توحید کی طرف رہبری کیجیے جن سے عوام کی توجہ تو بالکل ہی ہٹ چکی ہے اور علماء بھی کسی نہ کسی حد تک ان کے عملی مقتضیات سے غافل ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے رفقاء ان مشوروں پر عمل کرنے کا اہتمام کرینگے۔

تیسری نشست :- ۲۷ مارچ (نمازِ ظہر و نمازِ عصر کا درمیانی وقفہ)

یہ نشست صرف تجاویز کے لئے مختص تھی۔ چنانچہ بہت سے اصحاب نے کام کو آگے بڑھانے کے لئے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز کو اور ان پر ہونے والی بحث وتمحیص کو مختصراً یہاں اس لئے درج کیا جاتا ہے کہ جماعت کے ارکین اور ہمدرد اور اس کے کام کو تنقیدی نظر سے دیکھنے والے اصحاب یہ اندازہ کرسکیں کہ ہمارے حلقہ کے دماغ کس طرز پر سوچ رہے ہیں اور ذہنی طور پر کس پہلو سے کیا کمی ہے۔

اب یہاں اصل ترتیب کے مطابق ایک ایک تجویز کو پیش کیا جاتا ہے :-

تجویز ۱ ۔ مجوزہ نصراللہ خاں صاحب عزیز مدیر اخبار 'مسلمان' من جانب جماعتِ لاہور۔

اس تجویز کا منشا یہ تھا کہ کام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے ایک نگران تنظیم یعنی قیمِ جماعت کا تقرر عمل میں لایا جائے جو دورہ کر کے مختلف مقامی جماعتوں کو سرگرمِ عمل رکھے۔

اس پر صاحب امر کی طرف سے یہ کہا گیا کہ تجویز کی اہمیت تو بالکل ظاہر ہے البتہ مطلوبہ آدمی کا ہاتھ آنا اور اسکے اخراجات کا بار اٹھانے کی ہمت کرنا، یہ ہیں دو مشکلات۔ ان کا حل یوں ہوسکتا ہے کہ جماعت بیت المال کو مضبوط بنانے کی فکر کرے اور ادھر میں سوچکر کسی آدمی کو آزمائشی طور پر قیمِ جماعت کے منصب کے لیے مقرر کرتا ہوں۔ چنانچہ اس پر جماعت متفق ہوگئی۔

تجویز ۲ ۔ مجوزہ ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز (لاہور)

اس تجویز میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جماعت مرکز میں کچھ اہلِ دماغ و اہلِ قلم حضرات کو جمع کرے اور انہیں ریسرچ کے کام پر لگا دے، تاکہ وہ اطمینان سے جماعت کے نظریات کی اساس پر مختلف علوم کی تدوین کرتے رہیں۔ ملک صاحب نے ان حضرات کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے رائلٹی کا طریقہ بھی پیش کیا۔ اس پر کچھ گفتگو ہوئی اور آخر امیرِ جماعت کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کام کے لیے نہ صرف یہ کہ بسر اوقات کے لیے مناسب وظیفے کارکنوں کو دینے پڑیں گے بلکہ انکے رہنے سہنے کے لیے مرکز میں کافی عمارتیں ہونی چاہئیں۔ علاوہ بریں وسیع پیمانے پر ایک کتب خانہ مہیا کرنا ہوگا۔ یہ ساری ضروریات جنگ کے دَوران میں مہیا کرنا بہت مشکل ہے۔ ویسے میں خود اس قسم کے کام کو شروع کر دینے کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہوں اور شاید جنگ کے خاتمہ پر ایک سال کے اندر اندر شعبۂ علمی کے ماتحت ایک تحقیقی و تصنیفی مرکز کی بنیاد رکھ دی جائے۔ مگر اس چیز کا خیال رکھئے کہ تجارتی اصولوں پر یہ کام نہیں ہوگا، ورنہ کارکنوں میں کاروباری ذہنیت پیدا ہو جائیگی۔ دماغی اور علمی کام تو صرف خدمت کے اصول پر ہونے چاہئیں۔ بیت المال ایسے لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی تصوّرِ مزد کے بغیر مناسب وظائف دیتا رہے گا۔

تجویز ۳۔ مجوّزہ جناب غازی سلطان محمود صاحب آف مردوال (ضلع شاہ پور) مشمول تجویز جناب ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز منجانب جماعت لاہور۔

ہر دو حضرات کی تجاویز کا خلاصہ یہ تھا کہ مرکز موجودہ مقام سے منتقل کر کے کسی مرکزی مقام پر لایا جائے۔

اس پر امیرِ جماعت کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ جب تک کسی مقام پر ضرورت کے مطابق زمین اور زمین کو استعمال کرنے کے لئے ناگزیر وسائل فراہم نہ ہو جائیں، انتقالِ مرکز کی کوئی تجویز وزن نہیں حاصل کر سکتی۔ اس پر مختلف مقامات کے بعض اصحاب نے زمین یا دوسرے وسائل کی پیشکش کی۔

ان حضرات کو یہ کہا گیا کہ آپ جو کچھ جماعت کو دے سکتے ہیں، دیں ۔ جہاں بھی زمین اور وسائل فراہم ہو جائیں گے انہیں استعمال کرنے میں ہم دریغ نہ کرینگے ۔

تجویز ۴ ۔ مجوزہ جناب حافظ فتح محمد صاحب راہوں (جالندھر) بشمول تجویز جناب قاضی حمید اللہ صاحب (سیالکوٹ)

حافظ صاحب کی تجویز کا مدعا یہ تھا کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے مرکز میں جلدی ایک تربیت گاہ قائم ہو جانی چاہیے اور قاضی صاحب نے عام ارکانِ جماعت اور مبلغین کی ضروری تربیت کے لیے مناسب انتظام کا مطالبہ کیا ۔

اس تجویز کے جواب میں امیر جماعت نے وضاحت سے بتایا کہ یہ دونو کام ہمارے پیشِ نظر ہیں ۔ اسباب کی کمی کی وجہ سے اب تک دونو اسکیمیں معرضِ التوا میں رہیں، مگر اب مجبوراً توکلاً علی اللہ قدم آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے ۔ میں مولنا امین احسن صاحب اور بعض دوسرے رفقاء کے مشورہ سے نقشۂ کار مرتب کر کے اس سلسلہ میں بہت جلدی کام شروع کر دینے والا ہوں ۔

تجویز ۵ ۔ مجوزہ جناب محمد شریف صاحب (نوشہرہ) ۔

اس تجویز کا مفاد یہ تھا کہ جماعت کے ان اہلِ ہنر اراکین کو جو سرمایہ نہیں رکھتے جماعت کے سرمایہ سے کاروبار پر لگایا جائے ۔ ان لوگوں کی پوری کمائی بیت المال میں چلی جایا کرے اور انہیں صرف بقدرِ ضرورت معقول معاوضہ ملتا رہے ۔ اس سے مجوز کو بیت المال کی تقویت مطلوب تھی ۔

اس پر کافی دیر مشاورت ہوتی رہی اور آخر میں امیرِ جماعت اس نتیجہ پر پہنچے کہ کاروبار کے اصولوں پر بطور جماعت کوئی اسکیم عمل میں نہ لائی جانی چاہیے البتہ افراد آپس میں بطورِ خود اس طرز پر کام کریں تو اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا ۔ اس پر مجوز نے تجویز واپس لے لی ۔

دورانِ مشاورت میں چونکہ بیت المال کی تقویت کا مسئلہ زیرِ بحث آگیا تھا ۔ اس لئے ایک

تجویز حافظ عطاء الرحمٰن صاحب نے یہ پیش کی کہ جماعت کے جملہ ارکان کو اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ بیت المال کو ادا کرنا چاہیے ۔

اس پر امیرِ جماعت نے یہ فیصلہ دیا کہ ضابطہ بندی کے ذریعے سے ارکان کو انفاق پر آمادہ کرنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ ہاں جس رکن کو بطور خود اپنے فرض کا احساس ہو وہ اپنے اوپر خود پابندی عاید کرے ۔

اسکے بعد نعیم صدیقی صاحب نے ایک اور تجویز پیش کی جس کا مدعا یہ تھا کہ چونکہ ظالمانہ نظامِ معیشت نے حلال ذرائع آمدنی تک کو ناپاک بنا ڈالا ہے اور ہم میں سے کسی کی آمدنی بھی پاک نہیں رہ گئی ہے لہٰذا ہمارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ اضطرار کی رخصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم صرف ضروریاتِ زندگی کی حد تک اپنی آمدنیوں کو اپنے اوپر استعمال کریں اور بقیہ کو بیت المال کے حوالہ کر دینے کا التزام کریں۔ اس غرض کے لیے جماعت اخراجات کی مناسب تحدید کردے ۔

اس پر جناب امیر نے جواباً کہا کہ تحدیدِ اخراجات جس قانونیت کو مستلزم ہے اسے ہم اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مجوز نے یہ ترمیم کر دی کہ اگر قانوناً نہیں تو کم از کم اخلاقاً ہمیں اس کا پابند ہو جانا چاہیے۔ تجویز کی اس شکل سے جناب امیر نے اتفاق کر لیا۔ مگر دوسرے رفقاء کے اعتراضات کا سلسلہ چونکہ تھمنے میں نہیں آرہا تھا اس لیے مجوز نے برضا و رغبت اپنی تجویز واپس لے لی ۔

تجویز ۶ ۔ مجوزہ حافظ عطاء الرحمٰن صاحب (دار الاسلام) ۔

حافظ صاحب نے اس ضرورت کو واضح کیا کہ عہدِ حاضر کا انسان ایک نئے معاشی نظام کا طلبگار ہے اور جماعت اسلامی کو ایک مجلس تحقیق معاشیات مقرر کرنی چاہیے جو ایک طرف اسلامی اصولِ معیشت کو جمع کرے اور دوسری طرف موجودہ دور کے علم المعیشت کا مطالعہ کرے۔ حتیٰ کہ ایک نیا علم المعیشت مدون ہو جائے۔ یہ مجلس اپنے اخراجات کو سہ ماہی یا ششماہی رپورٹوں کی اشاعت

سے پورا کر سکتی ہے۔

اس تجویز کی اہمیت کو امیر جماعت نے تسلیم کیا مگر اس کام کو تجویز ۲ کے مطلوبات میں شمار کیا۔ یعنی جہاں ہمارا مجوزہ ادارہ تحقیقات علمیہ دوسرے مختلف علوم کی تدوین کرتا رہے گا وہاں معاشیات کے میدان میں بھی تحقیق و تدوین جاری رہے گی۔

تجویز ۷۔ مجوزہ محمد یحیٰ صاحب (دارالاسلام)

یہ تجویز جماعت کو ایک خاص پہلو سے معاشی تبدیلیوں پر آمادہ کرنے کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ جماعت مساواتِ آقا و غلام کے اصول پر ملازمین اور مزدوروں کے حقوق متعین کرے اور ان کی ادائیگی میں الاکین خاص مستعدی کا مظاہرہ کریں۔

اس تجویز پر جناب مولنا امین احسن صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگرچہ اصولاً یہ مطالبہ برحق ہے لیکن اگر تجویز کے مطابق مسئلہ پیشِ نظر کے چند محدود پہلو لیے جائیں تو ہم پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ ان کے پاس کوئی جامع نظام نہیں ہے، حالانکہ اسلام نے اس معاملہ میں بہت تفصیل سے احکام دیئے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان احکام کو تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ سے عام کیا جائے۔ اس کے بغیر اگر جز ئیاتی تغیر ہو تو ناکافی ہوگا۔

اس کے بعد جناب امیر نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ میں نے بہت سی تجویزوں کے دوران میں یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ بنیادیں اٹھانے سے پہلے کھڑکیاں اور روشندان بنا لینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ یہ سب چیزیں بجائے خود ضروری ہیں مگر اپنے مقام پر۔ اقدارِ دینی کو اُلٹ پلٹ دینا مفید نہیں ہوگا۔ جو معاشی اصلاح ہمیں مطلوب ہے وہ ضابطہ بندی سے نہیں ہوگی بلکہ ایمان اور اخلاق کے استحکام سے ہوگی۔ ہمیں ایک بچے کی طرح فطری ارتقا کرنا ہے، یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ قبل از وقت مصنوعی طور پر بالغ بننے کے لیے بازار سے ڈاڑھی خرید کر لگائیں۔

چاہے ماحول کا دباؤ اور مطالبہ کسی پہلو سے کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے، وقت سے پہلے کوئی اقدام مناسب نہیں ہوگا۔

اس بحث کے دوران میں امارت کی طرف سے یہ بھی وضاحت کردی گئی تھی کہ تحکم سے کسی تجویز کو رد نہیں کیا جائے گا بلکہ دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تجویز ۸۔ مجوزہ جناب محمد فاضل صاحب (امرتسر)

مجوز موصوف نے اساسی تعلیم کے لیے نصاب کی تدوین کی ضرورت کو پیش کیا اور جناب امیر نے اس پر مختصراً یوں اظہارِ خیال کیا کہ میرا مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ کچا کام کرنے پر میری طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ نصاب کا تقاضا بہت پُرزور ہے، مگر میں جامع اور اطمینان بخش کام کے لیے حالات کا منتظر ہوں۔ جماعتی حیثیت سے تو ہم وہی چیز پیش کریں گے جو جامع اور مکمل ہو۔ اس سے پہلے آپ لوگ اپنے اپنے مدارس کا کام چلانے کے لیے غیر رسمی طریقہ پر جماعت کے اُن اصحاب سے مشورہ لیں جو تعلیم کے کاموں سے نظری یا عملی تعلق رکھتے ہیں۔

تجویز ۹۔ مجوزہ جناب محمد فاضل صاحب (امرتسر)

اس تجویز کا اقتضاء یہ تھا کہ ہمارے اصحاب عربی بول چال کی عادت ڈالیں تاکہ قرآن و حدیث سمجھنے میں آسانی ہو اور اسلامی تمدن فروغ پانے لگے۔

اس پر جناب چوہدری محمد اکبر صاحب ہیڈ ماسٹر دلائل پور (م) نے یہ کہا کہ اب تک عربی پڑھنے والوں اور نہ پڑھنے والوں میں عملاً کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ خود عراق اور مصر و عرب کے لوگ عربی بولتے ہیں مگر وہ بھی مغربیت سے متاثر ہیں۔ ایسے غیر فطری طریقے ہمارے مقصد کے لیے کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔

اسکے بعد مولانا امین احسن صاحب نے یہ فرمایا کہ جہاں تک قرآن و حدیث کو سمجھنے سمجھانے کا تعلق ہے ہم ایک خاص گروہ کو اتنا تیار کردینا چاہتے ہیں کہ وہ محققانہ نظر سے دین کو سمجھے اور

سمجھائے۔ اس غرض کے لیے عربی بول لینے سے کام نہیں چلتا۔ رہے عوام تو انہیں ہم خود انہیں کی زبانوں میں اسلام کی سادہ تعلیم دیں گے۔

جنابِ امیر نے اس سلسلہ میں اپنی رائے دیتے ہوئے فرمایا کہ جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے اور جو حضرات عربی مدارس میں عربی پڑھتے اور بولتے ہیں وہ بھی اُس عربی سے ناواقف ہیں جو قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے لابدی ہے۔ ہم اُس عربی سے اپنے رفقاء کو واقف کرنا چاہتے ہیں مگر اس سلسلہ میں عربی بول چال کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگوں کی اوراپنی مادری زبانوں کو ختم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔

تجویز ۱۰۔ مجوزہ جنابِ امیر (دارالاسلام)

امارت کی طرف سے جماعت کا لٹریچر شائع کرنے کے لیے یونائیٹڈ پبلشرز (لاہور) اور جناب مولوی ثناء اللہ خاں صاحب (لاہور) کی طرف سے آئی ہوئی دو پیشکشوں (OFFERS) کو حاضرین کے سامنے رکھ کر مشورہ طلب کیا گیا کہ کس پیشکش کو قبول کیا جائے۔*

تجویز ۱۱۔ مجوزہ جناب حکیم محمد حسین صاحب (کپور تھلہ)

مجوز کا مطالبہ یہ تھا کہ امیرِ جماعت کی پوری اطاعت کو دستوراً لازم کر دیا جائے مگر اس پر فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ دستور کی ترمیم پوری جماعت کے اجتماع ہی میں اتفاقِ رائے سے ہو سکتی ہے لہٰذا اس محدود اجتماع میں اسے پیش نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ حکیم صاحب نے تجویز واپس لے لی۔ اس کے بعد کچھ سوالات کے زبانی جوابات دیے گئے۔

چوتھی نشست:۔ ۲۷ مارچ (نمازِ مغرب تا نمازِ عشا کا درمیانی وقفہ)

یہ نشست جنابِ امیر کی طرف سے ہدایات دینے کے لیے پروگرام میں مخصوص کی گئی تھی۔

* یونائیٹڈ پبلشرز دائمی حقوقِ اشاعت لینا چاہتے تھے مگر مولوی ثناء اللہ صاحب با معاوضہ کاغذ فراہم کرنے کی حد تک معاملہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس پر بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ مولوی ثناء اللہ خاں صاحب کی پیشکش کو قبول کر لیا جائے۔

چنانچہ یہ ہدایات ایک مربوط تقریر کی شکل میں دی گئیں جسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

امیرِ جماعت کی اختتامی تقریر

جو روداد میں صبح کی نشست میں جماعتوں کی طرف سے پیش ہوئی ہیں ان پر میرے محترم رفیق مولٰنا محمد امین احسن صاحب نے جو تبصرہ فرمایا ہے اسکے بعد مزید تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے بعض امور کے متعلق صرف چند مشورے پیش کرنے ہیں۔

سب سے پہلے تبلیغی پالیسی کے متعلق یہ سمجھ لیجیے کہ ہماری دعوت کا اصول "الاقدم فالاقدم" ہونا چاہیے۔ جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اس سے اتنا ہی پہلے تعرض کرنا چاہیے اور اس پر اتنا ہی زیادہ زور دینا چاہیے۔ اسی طرح جس چیز کی دینی اہمیت کم ہے اس پر بعد میں توجہ دی جانی چاہیے اور اس کی قدر و قیمت کو مبالغہ سے کبھی نہیں بڑھانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ جزئیات میں سے ایک ایک پر جدا جدا زور دینے کے بجائے اُس اصل الاصول کی فکر کرنی چاہیے جس کی اصلاح سے فروع کی اصلاح خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی مکان میں آگ لگی ہوئی ہے اور جگہ جگہ سے کڑیاں اور تختے جل جل کر گر رہے ہیں، ایسے موقع پر ایک ایک کڑی کے سقوط کو روکنے کے لیے الگ الگ تدابیر نہیں اختیار کی جائیں گی، بلکہ براہِ راست ایک ہی تدبیر سے آگ بجھانے کی فکر کی جائیگی۔ یا مثلاً اگر کسی شخص کا خون خراب ہو اور اس کے بدن پر جگہ جگہ پھوڑے پھنسیاں نمودار ہو رہے ہوں تو ایک ایک پھوڑے پر نشتر چلانے اور ایک ایک ناسور پر پھاہا رکھنے کی جگہ اصلاح خون کی تدبیر کی جائیگی۔ اس اصول پر ہمارے مبلغین کو مقامی حالات پر غور کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ لوگوں کی جزئی گمراہیوں کی اصل علت ہے کیا، اور پھر ہر ضرب اسی اصل علت کو دُور کرنے کے لیے لگائی جانی چاہیے۔ اس کام

کے دوران میں خرابی کی شاخوں کی کثرت سے ذرا بھی نہ گھبرانا چاہیے۔ اسی طرح جن اچھائیوں کو فروغ دینا ہے ان کی جڑ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور پھر اس کی آبیاری میں پوری جانفشانی دکھانی چاہیے۔ یہ جڑ اگر قائم ہو گئی تو پتے اور پھل پھول خود بخود نمودار ہوتے جائیں گے۔

جماعت کا پورا لٹریچر اسی اصول پر لکھا گیا ہے آپ جانتے ہیں کہ اس میں بنیادی امور کے استحکام کے لیے پورا زورِ استدلال صرف کیا گیا ہے مگر جزئیات کو بالعموم نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شاخوں کی کٹائی چھنٹائی کے بجائے جڑ اور تنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کے قصرِ حیات کے ملتے ہوئے نقوشِ زینت کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوں بلکہ اس کی بنیادوں کی فکر کریں ورنہ دیواروں کی خوبصورتی تو ترقی کر جائے گی مگر اس کی تکمیل سے پہلے آپ پوری عمارت کو کھنڈر بنتا ہوا دیکھنے پر مجبور ہونگے۔

ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آتا ہے تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے اور پھر ہر نشترِ اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ آپ لوگ اب اس مذاق کو یکسر بدل ڈالیے۔ بار بار کے تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ جزئیات پر حملہ کرنے سے ہم اپنے نصب العین میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ مباحثہ اور مناظرہ کی وادیوں میں سے ہو کر گذرتا ہے اور اس طرز پر کام کرنے سے خواہ مخواہ جذبات مشتعل ہوتے ہیں، طرح طرح کے چبھنے والے القاب مثلاً وہابی اور بدعتی وغیرہ زبانوں پر آنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ سر پھٹول تک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس طریقِ تبلیغ کو دہرانے سے قطعاً اجتناب کیجیے۔

جیسا کہ مولانا امین احسن صاحب نے اپنی تقریر میں واضح کیا ہے، اگر آپ حضرات غور کریں تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت تمام خرابیاں یا تو توحید کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں یا رسالت کی حقیقت کو نہ جاننے سے یا عقیدۂ معاد کی ناواقفیت سے۔ علاوہ بریں کچھ خرابیاں ایسی ہیں جو اصول و

فروعِ دین کی صحیح ترتیب کو اُلٹ دینے سے نمودار ہوئی ہیں۔ خود بگاڑ کے یہ اسباب بھی اپنا ایک سبب رکھتے ہیں اور وہ ہے کتاب وسنت سے بے تعلقی۔ یہ سب جہلا ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ بکثرت علماء تک کتاب وسنت سے براہِ راست گہری واقفیت نہیں رکھتے۔ اب ہمیں ان حالات کو بدلنا ہے تو اصلاح کا کام بنیاد سے شروع کر کے اوپر کی طرف لے جانا چاہئے۔ جب تک بنیادی معتقدات کی اصلاح نہیں ہو جاتی، لوگوں کی فروعی گمراہیوں کو صبر سے گوارا کرنا پڑے گا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فروعات کے معاملہ میں لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ پہلے قدم پر جزئی امور پر بہت زیادہ زور ہرگز نہ دیا جائے۔

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہونگے جو شرارت اور خبث کی بنا پر خرابیوں کی حمایت کریں گے۔ عوام بچارے محض جہالت کی وجہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ مدت ہائے دراز کی غلط تعلیم وتربیت سے ان کے ذہن میں یہ بات اُتر گئی ہے کہ جن طور طریقوں کو وہ اختیار کئے ہوئے ہیں، انہیں کا نام دین ہے۔ ان بچاروں کی اصلاح صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ صبر وتحمل سے بتدریج توحید، نبوّت اور معاد کے اسلامی تصوّرات کو ان کے دلوں میں راسخ کیا جائے۔ انکے عقاید کی اصلاح میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو کوئی مخالف "وہابی وہابی" پکار کر بھیڑ جمع نہیں کر سکے گا بلکہ خود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔

انقلابِ عرب پر اگر آپ غور کریں تو اس دعوے کی صداقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے روگردانی کرنے والوں میں بالکل مختصر سا گروہ ایسا تھا جو ذاتی اغراض کی بنا پر مخالفت کر رہا تھا۔ باقی سب لوگ فریب خوردہ اور مسحور تھے۔ پھر جب تحریک پھیل نکلی اور حق کھل کر سامنے آگیا تو بے غرض حق پسند لوگوں کے لیے انکار کے راستے مسدود ہو گئے۔ ملک کی عام آبادی نے صداقت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اغراض کی

بنا پر لڑ رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ میدان میں ہم ہار گئے ہیں اس لیے وہ سر جھکا دینے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی دعوتِ حق کی کامیابی کا یہی راستہ ہے۔ اگر آپ حقیقت کو لوگوں کے سامنے بالکل عریاں کر دیں تو ان میں سے نیک نیت فریب خوردہ لوگوں کی مسحوریت ختم ہو جائے گی اور وہ اپنے کبراء کو تنہا چھوڑ کر آپ کے ساتھ آملیں گے۔ پھر جو لوگ اغراض کی بنا پر سدِ راہ بنے ہوئے ہیں وہ بھی اتنے بے بس ہو جائیں گے کہ ہماری چلتی ہوئی گاڑی ان کے روکے نہ رُک سکے گی۔

یہ پروگرام اگر اختیار کرنا ہو تو پھر "امین بالجہر" اور "تیجے" اور "قُل" کے جھگڑے ختم کیجیے۔ غور تو کیجیے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ہی خرابیوں کی اصلاح کے لیے آئے تھے؟ کیا اسلام کا نصب العین بس اتنا ہی کچھ ہے؟ کیا قرآن کی تعلیمات انسان سے اتنا ہی کچھ مطالبہ کرتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کی پوری توجہ اُن مہماتِ امور کی طرف کیوں منعطف نہیں ہوتی جن کے لیے ہر دَور میں انبیاء علیہم السلام مخالفین کے مظالم کا تختۂ مشق بنتے رہے؟ یہ جزئیات جن کی اہمیت بہت بڑھا دی گئی ہے اقامتِ دین کے کام میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ فکر تو اس کی کیجیے کہ لوگ خدا کے دین کو برضا و رغبت تسلیم کریں اور سنتِ نبویہ کا اتباع کرنے پر آمادہ ہوں۔ یہ چیز پیدا ہو گئی تو پھر جس کو جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہوتی نظر آئے گی، وہ اسے اختیار کرے گا اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہ ملے گا اُسے ترک کر دے گا۔ زور تو اسی ایک بنیادی اصلاح پر دینا چاہیے۔ اصول سے فروع کی طرف لے چلنے کی جو تدریج اُسوۂ نبوی میں پائی جاتی ہے اسے اگر نظر انداز کر کے محض حدیث کی کتابوں کا اتباع شروع کر دیا جائے تو یہ حدیث کی کتابوں کا اتباع تو ہو گا، اُسوۂ نبوی کا اتباع نہ ہو گا۔

دَورِ اسلام سے پہلے کے عرب میں اس سے کم خرابیاں نہیں تھیں جتنی آج ہمارے دَور میں پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا بیک وقت سب پر چوٹ لگائی گئی تھی؟ کیا اصلاح کی وادی کو ایک ہی

جست میں طے کر ڈالا گیا؟ نہیں بلکہ پہلے اصلاح کی بنیادیں استوار کی گئیں، پھر اساسی اخلاقیات کی تعلیم دی گئی، پھر زندگی کے دامن سے ایک ایک داغ کو دھونے کا سلسلہ بتدریج کئی برس تک جاری رہا۔ اگر آپ حضرات نبی صلعم کا اتباع کرنا چاہتے ہیں تو پہلے نبیؐ کے طریقِ کار کو خوب سمجھ لیجیے پھر آگے قدم بڑھائیے۔

ایک اور چیز میں نے یہ محسوس کی ہے کہ ہمارے رفقاء میں کام کو مبالغہ سے پیش کرنے کا جذبہ بھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جذبہ کو ختم کر دیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ اپنی کارگذاری بتانے میں مبالغہ کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ اپنی جگہ اپنے کام کو تسلی بخش بھی نہ سمجھا جائے۔ بہتر سے بہتر طریقہ پر کام کر لینے کے بعد بھی مطمئن نہ ہو جائیے اور اسکے اچھے پہلوؤں پر قانع ہونے کے بجائے اس کے کمزور پہلوؤں کو دیکھ دیکھ کر بے چین رہئے۔ جو کام صحیح ہوا ہو اس پر خدا کا شکر بجا لائیے اور جو کمی رہ گئی ہو اسے دُور کرنے کی توفیق بھی اس سے طلب کیجیے۔ پھر مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ دوسری جماعتوں کے لوگوں میں کام کرتے وقت آپ پر مناظرہ کی روح چھا جاتی ہے اور مفاخرۃ و مکابرت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بہت اچھا ہے اور اگر درحقیقت یہ شبہ صحیح ہے تو ان بلاؤں سے نجات حاصل کیجیے۔

اس سلسلہ میں اپنے طرزِ عمل اور اپنے اندازِ گفتار سے دوسری جماعتوں پر یہ واضح کر دیجیے کہ ہم کسی سے جماعتی کشمکش نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری غرض خرابی کی بنیادوں کو مٹانا ہے اور ہمارا خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ جو بھی حق سے منحرف ہے ہم بس اس کی غلطی کو صاف بتا دینگے اس کے بعد ہمارا خاص طور پر اس کے خلاف کوئی معرکہ نہ ہوگا۔ بہر حال کسی جماعت کو کم از کم آپ کے طرزِ عمل کی وجہ سے اس بدگمانی کا موقع نہ ملنا چاہیے کہ آپ اس کے حریف بن کر اٹھے ہیں۔ ہمیں تو صرف نظامِ کفر و جاہلیت کا حریف بن کے رہنا ہے، اسی سے مقابلہ کرنا ہے اور

اُس کے ساتھ جس کی وابستگی جتنے درجہ کی ہو گی اسی تناسب سے ہماری اس کی دشمنی میں بھی شدت ہو گی۔

بعض اصحاب کی طرف سے پوچھا گیا ہے کہ آیا ہم اُن جلسوں اور ان تقریبات میں شریک ہو کر تقریریں کر سکتے ہیں جو عام انجمنوں کی طرف سے منعقد ہوا کرتی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ہمیں اس ذریعہ سے اپنے خیالات کو پھیلانے کے مواقع ملتے ہیں، مگر میرا مشاہدہ ہے کہ یہ طریق کار مفید نہیں ہے۔ ایک اسٹیج پر جب قسم قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور انہی کے دوران میں ہماری دعوت بھی پیش کی جاتی ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اُن بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ہمیں خوش کرنے کے لیے سُنائی جاتی ہیں یا یہ جلسہ ایک دماغی دسترخوان ہے جس پر جہاں اور طرح طرح کے مُربے اور اچار رکھے ہیں وہاں ایک نئی قسم کا یہ اچار بھی رکھ دیا گیا ہے۔ انجمن بازی کے نقارخانہ میں اگر بالفرض آپ نے بوجوہِ احسن اپنا پیغام پیش کر دیا تب بھی نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا کہ لوگ داد دیتے ہوئے یہ کہدیں کہ فلاں صاحب خوب بولے۔ ہماری قوم کا حال آجکل اُس بگڑے ہوئے رئیس کا سا ہو گیا ہے جس کے گرد وپیش بہت سے خوشامدی مصاحب لگے ہوئے ہوں اور اسے خوش کرنے میں منہمک ہوں۔ ان خوشامدیوں کے زمرے میں شامل ہو کر آپ حکمتِ دین اور حقائقِ زندگی کو خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ پیش کریں، بہر حال یہ رئیس المزاج قوم آپ کی باتیں انہی کانوں سے سُنے گی جن سے وہ دوسرے مصاحبوں کی باتیں سنتی ہے۔ ان وجوہ سے میں جماعت کے مقررین کو مشورہ دیتا ہوں کہ پہلے اپنی انفرادیت یا دوسرے لفظوں میں اپنی امتیازی حیثیت کو خوب مستحکم کر لیجیے اور بالکل جُداگانہ طور پر اپنے نظریات پیش کرتے رہیے۔ البتہ اگر یہ ممکن ہو کہ مارکیٹ میں جو خوش تقریر ریکارڈ خوب مقبول ہیں ان کے اندر آپ اپنا نغمہ بھر سکیں تو یہ صورت مفید ثابت ہو گی۔ مختلف لیڈروں اور مقرروں پر اپنا اثر اس حد تک

پھیلا دیجیے کہ ان کی تقریروں میں خواہ مخواہ آپ ہی کے خیالات آنے لگیں۔ جب وہ کچھ عرصہ تک محض قولاً ہمارے نظریات کو بیان کرتے رہیں گے تو بعید نہیں کہ ایک روز انہیں اپنے ضمیر کی آواز اور رائے عام کے دباؤ سے اپنی عملی روش کو بھی بدلنا پڑے گا۔ یہ اسکیم اگر خوب وسعت کے ساتھ عمل میں لائی جائے تو آخر کار اجرت پر تقریر کرنے والے مقررین جنہوں نے پوری قوم کا مزاج بگاڑ رکھا ہے، اسٹیج سے ہٹا دیے جائیں گے اور کام کے آدمیوں کو پبلک خود سامنے لے آئے گی۔

یہ معلوم کرکے مجھے بہت مسرت ہوئی کہ آپ حضرات جابجا اپنے نظریات کو پھیلانے کے لیے مدارس قائم کرنے کی فکر میں ہیں، بلکہ بعض مقامات پر تو عملاً قدم اُٹھ چکا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں یہ احتیاط ضرور کیجیے کہ ایک مدرسہ کو چلانا بجائے خود مقصد بن کر نہ رہ جائے۔ ہمیں تعلیم کو حصولِ مقصد کے ذریعہ کی حیثیت سے استعمال کرنا ہے۔ جہاں محسوس ہو کہ آپ کا مدرسہ مقصد کی جگہ لے رہا ہے یا مقصد میں رکاوٹ بن رہا ہے تو ایسے مدرسے کو مسمار کر دیجیے اور اس کے کھنڈروں کو روندتے ہوئے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھیے۔ اس غرض کے لیے نصب العین کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک قوم نے جو کارخانے خود جنگی اغراض کے لیے کروڑوں روپے کے صرف سے بنائے ہوتے ہیں، انہیں جب وہ اصل مقصد کی راہ میں رکاوٹ بنتے دیکھتی ہے تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے انہیں تباہ کر دیتی ہے۔ اسی جنگ میں روس نے اپنے بے شمار صنعتی مراکز کو اور فرانس نے اپنے بحری بیڑے کو تباہ کر دیا۔ یہ انتباہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ پہلے بھی ہمارے تعلیمی کام کرنے والے بہت سے بزرگوں سے یہی لغزش ہو چکی ہے، یعنی انہوں نے مدرسے چلانے کو ذریعہ کے بجائے مقصد کی حیثیت دے دی۔ آپ لوگ اس سلسلہ میں بہت احتیاط سے کام لیں۔

اب رہا مقامی کام اور تنظیم کے استحکام کا سوال، سو اس غرض کے لیے میں چند موٹی موٹی باتوں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔

سب سے پہلی توجہ طلب چیز یہ ہے کہ اپنے اپنے حلقہ کے ارکان میں مالی ایثار کے جذبہ کو اُبھاریئے۔ اب تک دوسرے مختلف جذبات تو تناسب سے کچھ زیادہ ہی اُبھرے ہیں مگر مالی ایثار کے جذبہ کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ ہاں اس ضمن میں یہ بات ضرور ملحوظ رہے کہ اس جذبہ کی اساس اخلاقی ذمہ داری کے احساس پر ہونی چاہیے۔ ضوابط سے یہ خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ہر شخص کو یہ سوچنا چاہیئے کہ جب وہ مسلمان ہوا ہے تو اسکے مال کو بھی مسلمان ہونا چاہیئے۔ جسم اور جان مسلمان ہو جائیں اور مال مسلمان نہ ہو تو اسلام کا اقتضا پورا نہیں ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ اپنے مال کو بھی دائرۂ اسلام میں لائیے اور اس کی شکل یہی ہے کہ اپنے کمزور بھائیوں کی دستگیری اور اپنے بیت المال کی تقویت میں اسے صرف کیجئے۔ "اُدخلوا فی السلم کافۃ" کا مدعا یہی ہے۔ پھر جذبۂ ایثار کی پیمائش اللہ کی راہ میں صرف کیے جانے والے مال کی مقدار سے نہیں ہوتی بلکہ ان تکلیف دہ حالات سے ہوتی ہے جن کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک شخص انفاق کرتا ہے۔ اس لحاظ سے بعض اوقات ایک پیسہ ایک ہزار روپیہ سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ خدا کے ہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ دیا کتنا بلکہ یہ کہ کن مشکلات کے ہوتے ہوئے دیا۔

دوسری چیز جس کا شدید پابندی سے اہتمام ہونا چاہیئے، ہفتہ وار اجتماع ہے۔ مختلف مقامات پر جماعتی نظام کے مرجانے کی وجہ یہی تھی کہ افراد کو مجتمع رکھنے اور جماعت کے ساتھ ان کی عملی دلچسپی کو زندہ رکھنے والے اس رشتہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں آئندہ نرمی سے کام نہ لیا جائے۔ ہر جگہ کے تمام مقامی ارکان کو

ہفتہ وار اجتماع کی شرکت کا لازماً پابند ہونا چاہیے۔ جو رکن کسی وجہ سے شرکت نہ کر سکے وہ اپنی غیر حاضری کے لیے معقول عذر اپنے امیر کے سامنے پیش کرے۔ اگر کسی کی طرف سے غلط معذرت پیش ہوگی تو آخر حقیقت کھل ہی جائے گی۔ نیز جو رکن بلا عذر یا غیر اہم عذرات کی بنا پر مسلسل چار ہفتہ وار اجتماعات میں شریک نہ ہو، یا ایک طویل مدت تک بیچ بیچ میں اکثر ناغہ کرتا رہے تو اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ نظامِ جماعت کی پابندیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ہفتہ وار مقامی اجتماع کے علاوہ، جہاں ایک ضلع میں یا قریب کے اضلاع میں متعدد ارکان موجود ہوں، وہاں باہمی صلاح مشورے سے وقت اور مقام کا تعین کر کے ہر دوسرے تیسرے مہینے اجتماعات منعقد ہوتے رہنے چاہییں جن کا پروگرام اُن ہدایات کی روشنی میں مرتب کر لیا جائے جو میں نے اجتماع دربھنگہ کے موقع پر ہفتہ وار اجتماعات کے لیے دی تھیں خصوصیت کے ساتھ جن علاقوں کے بیشتر ارکان مختلف دیہات اور شہروں میں منفرد ہوں، وہاں تو اس طرح کے سہ ماہی یا دو ماہی اجتماعات بہت ضروری ہیں، کیونکہ اس کے بغیر یہ منتشر ارکان آخر کار ضائع ہو جائیں گے۔

علاوہ بریں اپنے آپ کو مرکز سے وابستہ رکھنے میں غفلت نہ برتیے۔ اس وابستگی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ خطوط کے ذریعہ سے مجھے ہر پہلو سے مقامی حالات اور کام کی رفتار کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتے رہیے، مگر اس کا خیال رکھیے کہ چونکہ میرے پاس کوئی سیکرٹریایٹ نہیں ہے اس لیے کثرت سے جواب طلب خطوط نہیں آنے چاہییں۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے کام کی رپورٹ مرکز میں پہنچتی رہے یعنی جماعت کس حال میں ہے، کہیں سستی کا دور دورہ تو شروع نہیں ہو گیا، کہیں نظامِ کار کی مشینری میں کوئی نقص تو نہیں پیدا ہو گیا، کہیں

کوئی داخلی یا خارجی فتنہ تو نہیں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے حالات میں اصلاحِ احوال کے لیے مرکز ہر ضروری امداد بہم پہنچائے گا۔ اگر قیمِ جماعت کے فرائض ادا کرنے کے لیے مجھے کوئی مناسب آدمی مل گیا تو وہ دورہ کرکے مرکز کی طرف سے کام کی نگرانی بھی کرتا رہے گا۔ جب تک یہ صورت پیدا نہ ہو آپ لوگ خود آپس میں بھی مربوط رہیں اور وقتاً فوقتاً مرکز میں آکر چند روز بسر کرتے رہیں۔ آگے چل کر جب تربیتی مرکز قائم ہو گیا تو پھر مقامی جماعتوں کے امرا اور دوسرے سمجھدار ارکان یہاں آکر بہت زیادہ استفادہ کر سکیں گے۔

پکھور تھلہ کی جماعت تعلیمِ بالغان کی جو اسکیم عمل میں لا رہی ہے وہ مجھے بہت پسند آئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ کام ہر جگہ شروع ہو جانا چاہیے۔ اس سے ایک تو اللہ کی راہ میں باقاعدہ طور پر وقت کی قربانی کرنے کی عادت پڑے گی، دوسرے عوام سے آپ کا براہِ راست رابطہ ترقی کرے گا اور آپ ان سے بلا واسطہ خطاب کے مواقع حاصل کر لیں گے۔ نیز آپ تعلیم کو پھیلا کر اپنے لٹریچر کو پھیلانے اور اپنے پیغام کو فروغ دینے کے لیے بہت وسیع میدان تیار کر لیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ جو لوگ بھی آپ کی اِس بلا معاوضہ خدمت سے فائدہ اٹھائیں گے وہ آپ کے اخلاق سے اتنے متأثر ہو جائیں گے کہ نہایت آسانی سے آپ کی بات ان کے دلوں میں اُتر جائے گی۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ آپ صرف اس بات سے کر سکتے ہیں کہ ہماری تحریک کے پھیلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس ملک کے عوام کی جہالت ہے۔ دوسرے ممالک میں تعلیم کے عام ہونے کی وجہ سے یہ حال ہے کہ ایک کتاب ادھر پریس سے نکلی اور اُدھر بسا اوقات ایک ہفتہ میں پچاس لاکھ آدمیوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ خواندگی کی وجہ سے خیالات کے پھیلنے میں کتنی سرعت پیدا ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے ہمیں اپنے نظریات کو لوگوں تک پہنچانے میں بہت دیر لگتی ہے، اور برسوں کی کوششوں کے باوجود آبادی کے

ایک بہت ہی قلیل حصہ کو خیالات سے متاثر کیا جا سکتا ہے، اس رکاوٹ کو دُور کرنے میں جہاں تک ممکن ہو ہمیں اپنی مساعی صرف کرنی چاہئیں میں یہ نہیں کہتا کہ ہر آدمی یہی کام کرے، نہیں صرف وہ رفقا اس نازک کام کا بار اُٹھائیں جو تعلیمِ بالغان کے لیے ضروری صلاحیتیں رکھتے ہوں ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس سلسلہ میں جو لٹریچر شائع کیا ہے اس سے فائدہ اُٹھائیے اور جہاں کہیں اس میں سمیّت پائی جاتی ہو اس سے بچتے ہوئے کام لیجیے ۔ خصوصیت کے ساتھ تعلیمِ بالغان کا فن ان کے لٹریچر سے سیکھنے کی کوشش کیجیے ۔ پھر جوں جوں آپ عملاً کام کرتے جائیں گے تجربات سے آپ کی صلاحیتیں چمکتی جائیں گی اور رفتارِ کار بڑھتی جائے گی ۔ خدا کرے کہ آپ اپنے مقاصدِ حسنہ میں کامیاب ہوں ۔

اس تقریر کے ساتھ آخری نشست ختم ہو گئی ۔

خاتمہ آخری نشست کے ختم ہونے پر بیشتر لوگ سب سے پہلی گاڑی پر روانہ ہو گئے اور صرف وہ چند حضرات کچھ وقت کے لیے ٹھہر گئے جنہیں جناب امیر نے خود کسی ضروری مشورت کے لیے ٹھہرالیا تھا یا جنہیں اپنے متعلق کچھ ہدایات حاصل کرنی تھیں ۔

جہاں تک اجتماع کے مصارف کا تعلق ہے، ہمارے ہاں آرائش و تکلفات کے سلسلہ کے فضول مصارف سرے سے ہوتے ہی نہیں ۔ رہیں ضروریاتِ قیام وطعام سو اُن پر بھی ناگزیر حد تک خرچ کیا گیا ۔ ڈیڑھ سو افراد کے قیام اور شش وقتہ طعام و ناشتہ پر اس گرانی کے زمانہ میں ہماری لاگت چار سو روپیہ کے لگ بھگ رہی ۔ یہ سارا بار جماعت کے محدود بیت المال پر ڈالا گیا تھا کیونکہ چندہ کی اپیلیں کرنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے ۔ مگر بغیر کسی اپیل کے شرکائے اجتماع نے محض اپنی فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری کے ماتحت اجتماع کے دنوں میں جو رقوم بیت المال

میں داخل کرائیں ان کا مجموعہ مصارفِ اجتماع سے بہت زیادہ تھا۔

معذرت | جو حضرات ہمارے کام سے دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں یا اسے سمجھنے کے خواہشمند ہیں ان کی طرف سے یہ شکایت اور بجا شکایت کی گئی ہے کہ ہم نے اپنے اجتماعات میں زائرین (VISITORS) کو شرکت سے کیوں روک دیا۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے خیر اندیشوں سے معافی کے خواستگار ہیں۔ یقیناً ہم خود اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے کام کو سمجھنا چاہتے ہوں وہ ہمارے اجتماعات کی کارروائیوں کو ملاحظہ کریں۔ مگر مجبوری یہ درپیش تھی کہ دارالاسلام کی بستی مختصر سی چند عمارتوں پر مشتمل ہے اور اطراف و نواح میں کوئی دوسری بستی بھی موجود نہیں ہے۔ یہاں زیادہ مہمانوں کے لئے انتظام کرنا بہت مشکل تھا۔ ارکینِ جماعت کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ تو اپنے کام کے لیے آ رہے تھے اور قیام وطعام کے سلسلہ کی ہر تکلیف کو بخوشی گوارا کر سکتے تھے۔ ان کے لیے نہ تو مزدور بن کر کام کرنے میں عار تھی، نہ بستر اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلنے میں وہ تکلیف محسوس کرتے تھے، نہ بھوکا رہنا ان کے لیے گراں تھا اور نہ وہ کسی میزبان کی خدمت کے محتاج تھے۔ مگر ہماری غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ جماعت کے باہر کے لوگ یہاں آئیں اور انہیں کسی قسم کی تکلیف ہو۔ پھر یہ مشکلات دارالاسلام کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، بلکہ دہلی اور حیدرآباد کے منتظمین اجتماع کو بھی کوئی نہ کوئی انتظامی مشکل درپیش ہے کہیں راشن بندی کی وجہ سے اور کہیں کسی دوسری وجہ سے حالات کی رفتار بتاتی ہے کہ شاید اس قسم کی مشکلات دیر تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ اس لیے ہم کچھ مدت تک کے لیے اپنے ہمدردوں سے پیشگی اور یکبارگی معذرت طلب کرتے ہیں۔

حساب آمد و خرچ سنہ ۱۹۴۳ء

تفصیل آمدنی

فروخت کتب	۸۶۳۲	۹	۹
اعانت اہل خیر	۲۸۴۵	۳	۶
زکوٰۃ وصدقات واجبہ	۱۲۰۳	۵	۰
وصولی قرض	۲۰۲	۰	۰
امانت	۱۰	۸	۰
متفرق	۰	۹	۳
جملہ آمدنی سنہ ۴۳	۱۲۸۹۴	۳	۶
بقایا سال گذشتہ	۳۰۴۱	۱۰	۶
میزان کل	۱۵۹۳۵	۱۴	۰
جملہ خرچ سنہ ۱۹۴۳ء	۵۶۷۳	۰	۶
بقایا باختتام سنہ ۱۹۴۳ء	۱۰۲۶۲	۱۳	۶

تفصیل خرچ

ڈاک	۵۴۸	۱۳	۰
اسٹیشنری	۳۹	۱۵	۰
اعانت اہل حاجت	۴۲۴	۲	۳
قرض	۳۴۰	۰	۰
طباعت[۱]	۷۳۰	۹	۹
سفر خرچ	۲۳۰	۹	۰
مہمان خانہ	۸	۱۵	۳
معاوضہ کارکنان	۱۰۵۴	۱۳	۰
ادائے قرض	۱۶۰	۰	۰
تعلیمی اسکیم کے سلسلہ میں	۱۷	۰	۰
فرنیچر	۳۳	۱	۰
ایجنسی	۱۳۶۴	۱۵	۰
متفرق	۷۲۰	۳	۳
جملہ خرچ	۵۶۷۳	۰	۶

[۱] خرچ طباعت اس لیے کم دکھایا گیا ہے کہ سات ہزار روپے کے قریب رقمیں لاہور اور حیدرآباد کی جماعت کے کارکنان کو طباعت کے سلسلے میں علی الحساب دی گئی ہیں اور ابھی تک وہاں سے حساب کی آخری تفصیل نہیں آسکی ۔

رسائل و مسائل

سورۂ یوسفؑ کے متعلق چند سوالات

"سورۂ یوسفؑ کے مقامات سے متعلق آپکے فہم قرآنی سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم میں بتاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو تمکن فی الارض عطا فرمایا گیا اور وہ دائرۂ حکومت میں ایک ممتاز حیثیت سے شریک ہوگئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ ایک رسول تھے اس لیے فریضۂ رسالت کی سرانجام دہی بھی آپ کے لیے ضروری تھی۔ دربارِ فرعون کے مردِ مومن نے اپنی تقریر میں اسکی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی نبوت پر قومِ فرعون ایمان نہیں لائی تھی اور یہ بھی کہ آپ اپنی وفات تک ڈھیل دیتے رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کو پیش کیا لیکن فرعون اور اسکی قوم اس پر ایمان نہ لائی۔ اسکے باوجود حضرت یوسفؑ انکی حکومت میں شریک کار رہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول ایک غیر خدائی نظامِ حکومت کا شریکِ کار کس طرح رہا، درآنحالیکہ وہ اس قوم کے سامنے اپنی نبوت بھی پیش کر چکا تھا اور اس قوم نے اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایسے منکرینِ دعوتِ اسلامی کے خلاف یا تو حضرت یوسفؑ کو جہاد کرنا چاہیے تھا یا بر سبیلِ تنزل وہاں سے ہجرت لازم تھی۔ لیکن آپ نے نہ تو ہجرت ہی فرمائی اور نہ ہی ان کے خلاف جہاد کیا، بلکہ ان کے خلاف تبری اور بیزاری کا اعلان بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ کیا آپ اس گتھی کو سلجھائیں گے؟ دوسرا مسئلہ سجدۂ تعظیمی کا ہے۔ اس پر بھی روشنی ڈالیے"

بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ دور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گذرا ہے، قریب قریب بالکل تاریکی میں ہے، اس لیے قرآن کے اشارات کی تفصیل معلوم کرنا مشکل ہے۔ تاہم قرآن مجید نے اپنے مجمل

اشارات سے اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہنے دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت مصر میں غیر خدائی نظامِ حکومت کے "شریکِ کار" کی نہ تھی بلکہ وہی مختارِ کُل تھے اور انہوں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ہی اس شرط کے ساتھ تھی کہ کُل اختیارات انکے ہاتھ میں ہوں۔ اس آیت کو بغور پڑھیے :۔

قال اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم وکذلک مکّنّا لیوسف فی الارض یتبوّأ منہا حیث یشآء

یوسف نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر حاکم بنا دے یقیناً میں حفاظت کرنیوالا اور واقف کار ہوں! اور اس طرح ہم نے یوسف کو اُس سرزمین میں اقتدار عطا کیا کہ اسمیں جس جگہ کو چاہے اپنی جگہ بنالے۔

خط کشیدہ فقرے صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ مطالبہ کلّی اختیارات کا تھا اور ملے بھی کلّی اختیارات ہی "خزائن الارض" کا لفظ دیکھکر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ جگہ شاید فینانس ممبر یا ریونیو ممبر کی تھی حالانکہ دراصل اس سے مراد ملک کے جملہ وسائل (RESOURCES) ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مطالبہ یہ تھا کہ سلطنت مصر کے تمام وسائل میرے اختیار میں دیے جائیں، اور اسکے نتیجہ میں جو اختیارات انہیں ملے وہ ایسے تھے کہ پھر ساری سرزمینِ مصر اُنکی تھی۔ یتبوأ منہا حیث یشآء کو بھی لوگوں نے بہت محدود معنوں میں لیا ہے۔ انکے نزدیک اس کا مفہوم بس اتنا ہے کہ حضرت یوسفؑ ہر جگہ مکان بنا لینے یا قیام کرنے کے مجاز تھے۔ حالانکہ درحقیقت اس فقرے سے یہ تصوّر دلانا مقصود ہے کہ اس سرزمین پر حضرت یوسفؑ کا اقتدار ویسا ہی تھا جیسا ایک زمین کے مالک کو اپنی زمین پر حاصل ہوتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس طرح حضرت یوسفؑ کو جو اقتدار حاصل ہوا اسکے ذریعہ سے انہوں نے ملک کے نظامِ تہذیب، تمدن و اخلاق و سیاست کو اصولِ اسلام کے مطابق تبدیل کرنیکی کیا کوشش کی اور اس میں کس قدر کامیابی ہوئی، تو اسکے متعلق کوئی تفصیل ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی، البتہ سورۂ مائدہ کے ایک اشارہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں حضرت یوسفؑ کا اقتدار محض ایک شخص کا عارضی اقتدار نہ تھا بلکہ آپکے بعد ایک مدت دراز تک آپ ہی کے جانشین، جو یقیناً مسلمان ہی تھے، مصر پر حکمراں رہے، اور انہیں

وہ عظمت و شوکت حاصل ہوئی جو اس دور میں دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھی۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:-

واذ قال موسیٰ لقومہ یٰقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیآء وجعلکم ملوکاً وّ اٰتکم مالم یؤت احدا من العٰلمین	یاد کرو جب موسےٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم کے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء پیدا کیے اور تم کو فرمانروا بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس اسلامی غلبہ و تسلط کا لازمی اثر ملک کی پوری زندگی پر مترتب ہوا ہوگا۔

سورۂ مومن کی جس آیت سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قبطی قوم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، دراصل اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ وہاں ہندوستان کی سی صورت پیش آئی تھی کہ ملک کی آبادی کے ایک معتدبہ حصہ نے اسلام قبول کیا اور بڑی اکثریت اپنے شرک پر قائم رہی، پھر جس حصہ نے اسلام قبول کیا وہی ایک مدت تک برسرِ اقتدار رہا، مگر رفتہ رفتہ اخلاقی و اعتقادی انحطاط نے اسکو غلامی اور گمراہی کی پستیوں میں گرا دیا حتیٰ کہ غلو اور اشخاص پرستی کے فتنہ میں پڑکر عملاً اس میں اور دوسرے مشرکین میں کوئی خاص فرق باقی نہ رہا۔ اسی چیز کی طرف مومنِ آلِ فرعون نے اشارہ کیا ہے:-

ولقد جاءکم یوسف من قبل بالبیّنٰت <u>فما زلتم فی شکّ مّما جاءکم بہ</u> حتّیٰ اذا ھلک <u>قلتم لن یبعث اللہ من بعدہٖ رسولا</u>	اس سے پہلے یوسف تم لوگوں کے پاس صریح نشانیاں لیکر آئے تھے، مگر تم اُس چیز کے بارے میں برابر شک کرتے رہے جسے لائے تھے، پھر جب انکا انتقال ہوگیا تو تم نے کہا کہ اب انکے بعد اللہ کسی رسول کو ہرگز نہ بھیجے گا

خط کشیدہ دو فقروں میں سے پہلا فقرہ بتاتا ہے کہ حضرت یوسف کی زندگی میں ملک کی

بیشتر آبادی آپ کی نبوت کے متعلق شک میں رہی جیسا کہ اکثر انبیاء کے ساتھ ہوا ہے۔ اور دوسرے فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے بعد جو لوگ آپ کے معتقد ہوئے وہ آپ کی شخصیت کے گرویدہ ہو کر غلو میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب کوئی رسول نہیں آسکتا اور اسی بنا پر انہوں نے بعد کے آنیوالے کو ماننے سے انکار کر دیا، جیسا کہ آگے چل کر یہودیوں اور عیسائیوں نے کیا۔ درانحالیکہ حضرت یوسفؑ یا حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسےٰؑ میں سے کسی کے بعد بھی اللہ کی طرف سے ختمِ نبوت کا اعلان نہ ہوا تھا۔

بہرحال اس آیت سے یہ معنی نہیں نکالے جاسکتے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ملک میں کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا، بلکہ دوسرے اشارات کی مدد سے قیاس یہی ہوتا ہے کہ ملک میں اہلِ ایمان کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے بنی اسرائیل کے ساتھ مل کر ایک مدت تک اسلامی نظامِ حکومت کو قائم رکھا اور وہ بعد میں بتدریج مائل انحطاط (DEGENERATE) ہوتا چلا گیا۔

حضرت یوسفؑ کو انکے والدین اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا تھا اُس کی حقیقت جو میں تحقیق کر سکا ہوں، یہ ہے کہ قرآن مجید کے اس مقام پر "سجدہ" کا لفظ اُس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جو اسلامی اصطلاح کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی زمین پر ہاتھ، گھٹنے اور پیشانی ٹکانا۔ یہ اصطلاحی سجدہ تو فی الحقیقت سجدہ کی وہ مکمل صورت ہے جسے عبادتِ الٰہی کے لیے مختص کیا گیا ہے، ورنہ لغت میں اس کے معنی محض عاجزی اور نیازمندی کے ہیں جس کا اظہار کسی فعل یا حالت سے ہو سکتا ہے بنی اسرائیل کے ہاں یہ چیز آدابِ تہذیب میں داخل تھی کہ کسی کے احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یا کسی کے سامنے احترام کا اظہار کرنے کے لیے اس کے آگے کھڑے ہو کر سر خم کرتے تھے اور اسے ان کی زبان میں لفظ سجود سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ توراۃ کے عربی ترجمہ میں لکھا ہے کہ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے والے فرشتے جب حضرت ابراہیمؑ کے پاس انسانی صورت میں پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ انکے استقبال کے لیے نکلے اور زمین کی طرف جھکے (فلما نظر رکض لاستقبالھم من باب الخیمۃ

وسجد الی الارض)۔ اسی طرح جب حضرت سارہ کا انتقال ہوا اور بنی حت نے انکی قبر کے لیے زمین بلا معاوضہ پیش کی تو یہاں بھی حضرت ابراہیمؑ نے اُس قوم کے لیے اعترافِ احسان میں "سجدہ" کیا (فقام ابراھیم و سجد لشعب الارض لبنی حت۔ اور فسجد ابراھیم امام شعب الارض) یہ وہی چیز ہے جسے انگریزی میں BOW کرنا کہتے ہیں اور جو آج تک یورپ میں داخلِ آداب ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ظلم کے جواب میں جس عفو اور فضل اور احسان کا سلوک کیا تھا اور کنعان کی بدوی زندگی کے بجائے مصر میں شان اور عزت کے جس مقام پر انہیں پہنچایا تھا اسکے اعتراف و شکریہ میں انکے بھائیوں اور ان کے والدین نے اپنے ہاں کی تہذیب کے مطابق سر خم کیا اور یہی وہ بے اختیارانہ جھکاؤ تھا جسے قرآن نے "خرّوا له سجدًا" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

رشوت و خیانت کے متعلق چند مزید مسائل

"رشوت و خیانت کے متعلق ترجمان القرآن کے ایک گذشتہ پرچہ میں رسائل و مسائل کے زیرِ عنوان آپ نے جن مسائل پر بحث کی ہے انہیں کے متعلق چند مزید سوالات مجھے درپیش ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کے مدلل جوابات سے میرے اور میرے بعض رفقا کے شبہات کو دور فرما دینگے۔ سوالات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ایسا افسروں کو ٹی پارٹیاں دینا بھی کیا رشوت میں شمار ہوگا جن کو حکومت کسی ایک فرد یا جماعت کے کام کی جانچ پڑتال کے لیے وقتی طور پر مقرر کرتی ہے؟ یہ لوگ تو غالباً اصطلاحی افسر کی حیثیت نہیں رکھتے، پھر ان کی خاطر و مدارات میں کیا حرج ہے؟

۲۔ ایک گروہِ کثیر کا خیال ہے کہ گورنمنٹ کا مال، بالخصوص وہ مال جو پبلک کے مفاد پر صرف نہیں ہوتا بلکہ اسے گورنمنٹ اپنے مفاد اور تحفظ پر صرف کرتی ہے، جس صورت میں بھی لیا جاسکے، لے لینا

جائز ہے۔ یعنی خیانتاً یا بذریعہ رشوت وغیرہ۔ اس پر دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ سُود جس کا لینا دینا قطعی حرام ہے، اعاظم علما کے فتووں کے مطابق سرکاری بنک سے وصول کر لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اسے بنک میں چھوڑا جائے تو عیسائی مشنریوں کی وساطت سے وہ خود اسلام کے خلاف استعمال ہوگا۔ پھر فرمایئے کہ وہ مال جو کسی غلط نظامِ حکومت کے استحکام میں صرف ہوتا ہے اور جس کے متعلق یہ بھی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کا اپنا نہیں ہے بلکہ رعایا ہی سے بطورِ غصب لیا گیا ہے، کیوں نہ اسے ہر ذریعہ سے واپس حاصل کیا جائے؟"

آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کا جواب دینے سے پہلے اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم جو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز پر زور دیتے ہیں اور لوگوں کو اپنی اخلاقی ذمہ داریاں سمجھنے اور انہیں ملحوظ رکھنے کی تاکید کرتے ہیں، اس سے ہماری غرض ہرگز یہ نہیں ہے کہ موجودہ نظامِ باطل کو ایک ایسی پرہیزگار رعایا فراہم کر کے دیں جو اُن کے لیے کم سے کم حد تک وجہ پریشانی ہو۔ درحقیقت اس نظامِ باطل کے طبعی اور لازمی ثمرات یہی ہیں کہ لوگ اخلاقی ذمہ داریوں سے بے پروا اور اپنی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے میں قانون کی گرفت کے سوا ہر دوسری قید سے آزاد ہوں۔ ملازموں کا رشوت خوار اور خائن ہونا اور رعیت کا وسیع معنوں میں چور ہونا اس نظام کا لازمی نتیجہ ہے، اس نظام نے انہیں صفات کی تخم ریزی کی ہے اور یہ نظام اس کا مستحق ہے کہ اس کے لیے یہی ثمرات اسکی تخم ریزی کے نتیجہ میں پیدا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خائنوں، چوروں اور بداخلاق لوگوں کی قیادت میں پاکیزہ اخلاق رکھنے والے لوگ تو پرورش نہیں پا سکتے۔ پس اخلاق کی گفتگو سے ہماری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ اِن بدسیرت اور بدکردار کارفرماؤں کو انکی کشت خبیث کے زہریلے ثمرات سے بچائیں اور صالح ثمرات اِن کے لیے فراہم کریں۔ مگر ہمیں جو کچھ فکر ہے وہ دراصل خود اپنے اخلاق اور اپنی سیرت و کردار کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس نظام کے بُرے اثرات سے اپنے بھائیوں

کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بچائیں اور ان کے اندر اُن اعلیٰ درجہ کے اخلاق کو نشو و نما دیں جن کی بدولت وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں موجودہ بدعمل کارکنوں اور کارفرماؤں کی بہ نسبت صالح تر ٹھیریں اور اللہ تعالیٰ دنیا کی قیادت کے لیے اُن کی بہ نسبت اِن کو اہل تر قرار دے۔ اس غرض کے لیے ہم اُن بُرائیوں سے بھی لوگوں کو بچنے کا مشورہ دیتے ہیں جن کا ارتکاب اگرچہ موجودہ نظام کے مقابلہ میں کوئی بُرائی نہیں ہے بلکہ شاید بھلائی کی تعریف میں آسکتا ہے، مگر وہ بجائے خود اخلاق اور شریعت کی نگاہ میں مذموم ہیں۔ اب میں سلسلہ وار آپ کے سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں:۔

۱۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، خواہ اپنے مستقل افسر ہوں یا کسی دوسرے محکمہ کے لوگ ہوں جنہیں جانچ پڑتال وغیرہ کے لیے مقرر کیا جاتا ہے، اُن کے ساتھ مخلصانہ محبت اور شخصی عقیدت و گرویدگی کا تعلق شاید ایک فی ہزار حالات میں بھی نہیں ہوتا اور اگر ان سے مفاد وابستہ نہ ہوں تو غالباً کوئی شخص ان کی خاطر و مدارات کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ یہ دعوتیں اور ٹی پارٹیاں سب اسی غرض سے ہوتی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی فائدہ، کوئی رعایت یا کم از کم چشم پوشی حاصل کی جائے۔ اس لیے فی الحقیقت یہ بھی اُسی طرح رشوت کی تعریف میں آتی ہیں جس طرح عام اور معروف رشوت۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر اپنی اصولی توضیح میں بیان کیا ہے اس کے خلاف ہمیں جو کچھ بھی اعتراض ہے، اس بنیاد پر ہے کہ ایسی پارٹیوں کے دینے اور قبول کرنے سے ہمارے اپنے بھائیوں میں ناجائز ذرائع سے کام نکالنے اور لوگوں سے ناجائز فائدے اٹھانے کی بیماری پرورش پاتی ہے۔ ورنہ یہ سارا نظام تو حرام سے بنتا، حرام کھاتا اور حرام ہی اُگلتا ہے۔

۲۔ اس سوال کو جس طریقہ سے آپ نے پیش کیا ہے اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ آپ یا جن لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے، صرف اس پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں کہ ایک فریق کے پاس مال

کس نوعیت کا ہے، مگر اس پہلو کو پیشِ نظر نہیں رکھتے کہ دوسرا فریق اس کو حاصل کس حق کی بنا پر کر رہا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ چور ہے اور اسکے پاس سارا مال چوری کا ہے۔ پھر کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ میرے لیے اسکے ہاں چوری کرنا یا اسکی جیب کتر لینا جائز ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اگر متعین طور پر مجھے معلوم ہو کہ اسکے قبضہ میں فلاں مخصوص چیز میرے مملوکہ مال سے چرائی ہوئی ہے اور پھر میں کسی وقت اسے حاصل کر لینے پر اپنے آپ کو قادر پاؤں تو میرے لیے اس کا حاصل کر لینا جائز ہو گا۔ لیکن یہ عام مفروضہ صحیح نہیں ہے کہ چور کے مقبوضہ مال کو چرا لینا بہر حال ہر شخص کے لیے حلال ہے۔

سود کی جو مثال آپ نے دی ہے وہ یہاں اس لیے منطبق نہیں ہوتی کہ سود ہم بینکر سے چھینتے یا چراتے نہیں ہیں بلکہ وہ خود اپنے قاعدہ کے مطابق اسے نکالتا ہے اور ہم اس لیے مجبوراً اسے لے لیتے ہیں کہ اسے چھوڑنا ڈاکو کے اسلحہ خانہ میں چند اور تلواروں کا چھوڑنا ہے تاکہ وہ ان سے مظلوموں کو ذبح کرنے میں اور زیادہ مدد لے۔ پھر اس سُود کو بھی وصول کر کے خود اپنے استعمال میں لانا حلال نہیں ہے، بلکہ اسے نادار طبقوں میں تقسیم کر دینا چاہیے، اس لیے کہ یہ سارا سُود دراصل اُن غریبوں ہی کی جیب سے آتا ہے جو کسی دوسرے پر اس بلا کو پھینک دینے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہاں پھر یہ سمجھ لیجیے کہ ہم حکومت کے اموال پر دست درازی کی مخالفت اس لیے نہیں کرتے کہ یہ حکومت کسی ایماندارانہ برتاؤ کی مستحق ہے، بلکہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ خود ہمارے اندر استحقاق کے بغیر فائدہ اُٹھانے کی بیماری پرورش نہ پائے۔

مقالات

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

یہ مقالہ ۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھا گیا تھا

معمولی حالات میں، جبکہ زندگی کا دریا سکون کے ساتھ بہ رہا ہو، انسان ایک طرح کا اطمینان محسوس کرتا ہے، کیونکہ اوپر کی صاف شفاف سطح ایک پردہ بن جاتی ہے جس کے نیچے تہ میں بیٹھی ہوئی گندگیاں اور غلاظتیں چھپی رہتی ہیں اور پردے کی اوپری صفائی آدمی کو اس بات کا تجسس کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہونے دیتی ہے کہ تہ میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے اور کیوں چھپا ہوا ہے لیکن جب اس دریا میں ہیجان اور طوفان برپا ہوتا ہے اور نیچے کی چھپی ہوئی ساری گندگیاں اور غلاظتیں ابھر کر برسر عام سطح دریا پر بہنے لگتی ہیں، اس وقت اندھوں کے سوا ہر وہ شخص جس کے دیدوں میں کچھ بھی بینائی کا نور باقی ہے، ہر اشتباہ کی گنجائش کے بغیر صاف صاف دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کا دریا یہ کچھ اپنے اندر لئے ہوئے چل رہا ہے، اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب عام انسانوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے کہ اس منبع کا سراغ لگائیں جہاں سے دریائے زندگی میں یہ گندگیاں آ رہی ہیں اور اس تدبیر کی جستجو کریں جس سے اس دریا کو پاک کیا اور رکھا جا سکے۔ فی الواقع اگر ایسے وقت میں بھی لوگوں کے اندر اس ضرورت کا احساس بیدار نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ نوع انسانی اپنی غفلت کے نشے میں مدہوش ہو کر سود و زیاں سے بالکل ہی بے فکر ہو چکی ہے۔

یہ زمانہ جس سے ہم آج کل گذر رہے ہیں ایسی ہی غیر معمولی حالات کا زمانہ ہے۔ زندگی کا دریا اس وقت اپنی طغیانی پر ہے، ملک ملک اور قوم قوم کے درمیان سخت کشمکش برپا ہے اور یہ کشمکش اتنی گہرائی تک اتری ہوئی ہے کہ بڑے بڑے مجموعوں سے گذر کر فرد فرد تک کو نزاع کے میدان میں کھینچ لائی ہے۔ اس طرح عالم انسان کے

بیشتر حصہ نے اپنے وہ تمام اخلاقی اوصاف اُگل کر منظر عام پر رکھ دیئے ہیں جنہیں وہ مدتوں سے اندر ہی اندر پرورش کر رہا تھا۔ اب ہم اُن گندگیوں کو علانیہ سطح زندگی پر دیکھ رہے ہیں جن کو تلاش کرنے کے لیے پہلے کچھ نہ کچھ تعمق کی ضرورت تھی۔ اب صرف ایک مادرزاد اندھا ہی اس غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتا ہے کہ "بیمار کا حال اچھا ہے"، اور صرف وہی لوگ بیماری کی تشخیص اور علاج کی فکر سے غافل رہ سکتے ہیں جو حیوانات کی طرح اخلاقی حس سے بالکل خالی ہیں یا جن کے اخلاقی احساسات پر فالج گر گیا ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ پوری پوری قومیں بہت بڑے پیمانے پر اُن بدترین اخلاقی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کے ضمیر نے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بے انصافی، بے رحمی، ظلم و ستم، جھوٹ، فریب، دغا، مکر، بدعہدی، خیانت، بے شرمی، نفس پرستی، استحصال بالجبر اور ایسے ہی دوسرے جرائم محض انفرادی جرائم نہیں رہے ہیں بلکہ قومی اخلاق کی حیثیت سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اجتماعی حیثیت سے وہ سب کچھ کر رہی ہیں جس کا ارتکاب کرنے والے افراد ابھی تک نکٹّل جیلوں میں ٹھونسے جاتے ہیں۔ ہر قوم نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے بڑے سے بڑے مجرموں کو اپنا لیڈر اور سرپلہ کار بنایا ہے اور ان کی قیادت میں بدمعاشی کی کوئی مکروہ سے مکروہ قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کا کھلم کھلا نہایت بے حیائی کے ساتھ وسیع پیمانے پر وہ ارتکاب کر رہی ہوں۔ ہر قوم دوسری قوم کے خلاف جھوٹ تصنیف کر کے علانیہ نشر کر رہی ہے اور ریڈیو کے ذریعہ سے ان جھوٹوں نے فضائے اثیر تک کو گندا کر دیا ہے۔ پورے پورے ملکوں اور براعظموں کی آبادیاں لٹیروں اور ڈاکوؤں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور ہر ڈاکو عین اسوقت جبکہ وہ خود ڈاکہ مار رہا ہوتا ہے نہایت بے شرمی کے ساتھ اپنے مقابل کے ڈاکو کی اُن ساری گناہ گاریوں کا تذکرہ کرتا ہے جن سے داغدار ہونے میں اس کا اپنا دامن بھی اپنے حریف سے کچھ کم سیاہ نہیں ہوتا۔ انصاف کے معنی ان ظالموں کے نزدیک صرف اپنی قوم کے ساتھ انصاف کے رہ گئے ہیں۔ حق جو کچھ ہے ان کے لئے ہے۔ دوسروں کے حقوق پر ہر دست درازی ان کے اخلاقی قانون میں جائز بلکہ کارِ ثواب ہے۔

قریب قریب تمام قوموں کا حال یہ ہو چکا ہے کہ ان کے ہاں لینے کے پیمانے اور ہیں اور دینے کے اور۔ جتنے معیار وہ اپنے مفاد کے لئے قائم کرتی ہیں، دوسروں کے مفاد کا سوال سامنے آتے ہی وہ سب معیار بدل جاتے ہیں، اور جن معیاروں کا وہ دوسروں سے مطالبہ کرتی ہیں ان کی پابندی خود کرنا حرام سمجھتی ہیں۔ بدعہدی کا مرض اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اب ایک قوم کو دوسری قوم پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا۔ بڑی بڑی قوموں کے نمائندے نہایت مہذب صورتیں لئے ہوئے جب بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کر رہے ہوتے ہیں، اُس وقت ان کے دلوں میں یہ خبیث نیت چھپی ہوتی ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی اس مقدس بکرے کو قومی مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائیں گے، اور جب ایک قوم کا صدر یا وزیر اعظم اس قربانی کے لئے چھری تیز کرتا ہے تو پوری قوم میں سے ایک آواز بھی اس بداخلاقی کے خلاف نہیں اُٹھتی، بلکہ ملک کی پوری آبادی اس کے ساتھ اس جُرم میں شریک ہو جاتی ہے۔ مکاری کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے پاکیزہ اخلاقی اصولوں کی گفتگو کی جاتی ہے صرف اسلئے کہ دنیا کو بیوقوف بنا کر اپنے مفاد کی خدمت اُس سے لی جائے اور سادہ لوح انسانوں کو یقین دلایا جائے کہ تم سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ جو ہم کر رہے ہیں یہ کچھ اپنے لئے نہیں ہے بلکہ ہم بے غرض، نیکوں کے نیک لوگ یہ ساری تکلیفیں محض انسانیت کی بھلائی کے لئے برداشت کر رہے ہیں۔ سنگدلی وبیرحمی اس مرتبۂ کمال پر پہنچی ہے کہ ایک ملک جب دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو اسکی آبادی کو روندنے اور کچلنے میں محض اسٹیم رولر کی سی بے حسی ہی اس سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ نہایت مزے لے لے کر دنیا کو اپنے ان کارناموں کی اطلاع دیتا ہے، گویا اسے معلوم ہے کہ اب دنیا انسانوں سے نہیں بلکہ صرف بھیڑیوں سے آباد ہے۔ خود غرضانہ شقاوت اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے مفاد کے لئے مسخر کرنے کے بعد صرف یہی نہیں کہ بیدردی کے ساتھ اسے لُوٹتی کھسوٹتی ہے بلکہ نہایت منظم طریقے سے پیہم کوشش کرتی رہتی ہے کہ انسانیت کے تمام شریفانہ خصائل سے اس کو خالی کردے اور وہ تمام کمینہ اوصاف اسکے

اندر پرورش کرے جنہیں وہ خود نہایت گھناونا سمجھتی ہے ۔

یہ چند نمایاں ترین اخلاقی خرابیاں میں نے محض نمونے کے طور پر بیان کی ہیں، ورنہ تفصیل کے ساتھ اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پوری انسانیت کا جسم اخلاقی حیثیت سے سڑ گیا ہے۔ پہلے قحبہ خانے اور قمار بازی کے اڈے اخلاقی پستی کے سب سے بڑے پھوڑے سمجھے جاتے تھے، لیکن اب تو ہم جدھر دیکھتے ہیں انسانی تمدن پورا کا پورا ہی ایک پھوڑا نظر آرہا ہے۔ قوموں کی پارلیمنٹیں اور اسمبلیاں، حکومتوں کے سکرٹریٹ اور وزارت خانے، عدالتوں کے ایوان اور وکالت خانے، پریس اور نشر گاہیں، یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے، بینک اور صنعتی و تجارتی کاروبار کے مجامع، سب کے سب پھوڑے ہی پھوڑے ہیں جو کسی تیز نشتر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ علم جو انسانیت کا عزیز ترین جوہر ہے آج اُس کا ہر شعبہ انسانیت کی تباہی کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ طاقت اور زندگی کے تمام وسائل جو قدرت نے انسان کے لئے مہیا کئے تھے فساد اور خرابی کے کاموں میں ضائع کئے جا رہے ہیں۔ اور وہ صفات بھی، جو انسان کی بہترین اخلاقی صفات سمجھی جاتی تھیں، مثلاً شجاعت، ایثار، قربانی، فیاضی، صبر، تحمل، اولوالعزمی، بلند حوصلگی وغیرہ، آج ان کو بھی چند بڑی اور بنیادی بداخلاقیوں کا خادم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اجتماعی خرابیاں اُس وقت اُبھر کر نمایاں ہوتی ہیں جب انفرادی خرابیاں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ آپ اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ کسی سوسائٹی کے بیشتر افراد نیک کردار ہوں اور پھر وہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی بدکرداری کا مظاہرہ کرے۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ نیک کردار لوگ اپنی قیادت اور نمائندگی اور سربراہ کاری بدکردار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں، اور اس بات پر راضی ہو جائیں کہ ان کے قومی اور ملکی اور بین الاقوامی معاملات کو غیر اخلاقی اصولوں پر چلایا جائے۔ اس لئے جب وسیع پیمانے پر دنیا کی قومیں ان گھناونے اور رذیل اخلاقی اوصاف کا

اظہار اپنے اجتماعی اداروں کے ذریعہ سے کر رہی ہیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آج نوع انسانی اپنی تمام علمی و تمدنی ترقیوں کے باوجود ایک شدید اخلاقی تنزّل میں مبتلا ہے اور اس کے بیشتر افراد اس وبا سے متاثر ہو چکے ہیں۔ یہ حالت اگر یونہی ترقی رہی تو وہ وقت دور نہیں جب انسانیت کسی بہت بڑی تباہی سے دوچار ہو گی اور ایک طویل عہد ظلمت اس پر چھا جائے گا۔

اب اگر ہم آنکھیں بند کر کے تباہی کے گڑھے کی طرف سرپٹ جانا نہیں چاہتے تو ہمیں کھوج لگانا چاہیے کہ اس خرابی کا سرچشمہ کہاں ہے جہاں سے یہ طوفان کی طرح امڈی چلی آرہی ہے۔ چونکہ یہ اخلاقی خرابی ہے لہٰذا لامحالہ ہمیں اس کا سراغ اُن اخلاقی تصورات ہی میں ملے گا جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کے اخلاقی تصورات کیا ہیں؟ اس سوال کی جب ہم تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اصولاً یہ تمام تصورات دو بڑی قسموں پر منقسم ہیں:

ایک قسم کے تصورات وہ جو خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر مبنی ہیں

دوسری قسم کے تصورات وہ جو ان عقیدوں سے الگ ہٹ کر کسی دوسری بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔

آئیے اب ہم ان دونوں قسم کے تصورات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ دنیا میں اس وقت یہ کس صورت میں پائے جاتے ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں۔

خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر جتنے اخلاقی تصورات قائم ہوتے ہیں انکی صورت کا تمام تر انحصار اُس عقیدے کی نوعیت پر ہوتا ہے جو خدا اور حیات بعد موت کے متعلق لوگوں میں پایا جاتا ہو۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ دنیا اس وقت خدا کو کس شکل میں مان رہی ہے اور دوسری زندگی کے متعلق اس کے عام تخیلات کیا ہیں۔

خدا کو ماننے والے بیشتر انسان اِس وقت شرک میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے اپنے زعم میں خدائی کے اکثر اختیارات، خصوصاً وہ اختیارات جن کا تعلق ان کی اپنی زندگی سے ہے، دوسری ہستیوں پر تقسیم کر دئے ہیں اور اُن ہستیوں کا خیالی نقشہ اپنی خواہشات کے مطابق ایسا بنا لیا ہے کہ وہ اپنے اِن خدایانہ اختیارات کو ٹھیک اُسی طرح استعمال کرتی ہیں جس طرح یہ چاہتے ہیں کہ وہ استعمال کریں۔ یہ گناہ کرتے ہیں، وہ بخشوا لیتی ہیں۔ یہ فرائض سے غافل اور حقوق سے بے پرواہ ہو کر بے مہار جانور کی طرح حرام و حلال کی تمیز کے بغیر دنیا کی کھیتی کو چرتے پھرتے ہیں اور وہ کچھ نذر و نیاز کے عوض اِن کی نجات کی ضمانت لے لیتی ہیں۔ یہ چوری بھی کرنے جاتے ہیں تو اُن کی عنایت سے تھانیدار سوتا رہ جاتا ہے۔ اُنکے اور ان کے درمیان یہ سودا طے ہو گیا ہے کہ یہ اُن کی طرف سے عقیدہ اچھا رکھیں اور نذر پیش کرتے رہیں، اور اس کے جواب میں وہ اِن کے سب کام، جو کچھ بھی یہ کرنا چاہیں، بناتی رہیں گی اور مرنے کے بعد جب خدا اِنہیں پکڑنا چاہے گا تو وہ بیچ میں حائل ہو کر کہہ دیں گی کہ یہ ہمارے دامن کے سایہ میں ہیں، اِن سے کچھ نہ کہا جائے۔ بلکہ بعض جگہ تو اس پکڑ دھکڑ کی نوبت ہی نہ آئے گی کیونکہ ان کے گناہوں کا کفارہ پہلے ہی کوئی ادا کر چکا ہے۔ اِن مشرکانہ عقائد نے زندگی بعد موت کے عقیدے کو بھی بے معنی کر دیا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری اخلاقی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں جو مذہب نے تعمیر کی تھیں۔ مذہبی اخلاقیات کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں، اور زبانوں پر اُن کا ذکر بھی احترام کے ساتھ آتا ہے مگر عملاً ان کی پابندی سے بچنے کے لئے شرک نے فرار کی بے شمار راہیں فراہم کر دی ہیں اور کچھ اس شان سے فراہم کی ہیں کہ جس راہ سے بھی یہ چاہیں بھاگیں، بہر حال اِنہیں اطمینان ہے کہ آخر کار پہنچیں گے نجات ہی کی منزل پر۔

شرک سے قطع نظر، جہاں خدا پرستی اور عقیدہ آخرت کچھ بہتر صورت میں موجود ہے، وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے مطالبات سکڑ کر انسانی زندگی کے ایک بہت چھوٹے دائرے میں محدود ہو گئے

ہیں۔ چند اعمال، چند رسوم، اور چند پابندیاں ہیں جن کا، محدود انفرادی و معاشرتی زندگی میں خدا ان سے مطالبہ کرتا ہے اور انہی کے معاوضے میں اس نے ایک بہت بڑی جنت ان کے لئے مہیا کر رکھی ہے۔ اگر یہ اُن مطالبوں کو پورا کر دیں تو پھر کوئی چیز خدا کی طرف سے ان کے لئے کرنے کی نہیں رہ جاتی، اس کے بعد یہ آزاد ہیں کہ اپنی زندگی کے معاملات جس طرح چاہیں چلائیں۔ اور اگر اُن خدائی مطالبوں میں بھی کوتاہی رہ جائے تو اس کی رحمت اور نکتہ نوازی پر بھروسا ہے کہ وہ گن ہوں کے پشتارے ان سے جنت کے دروازے پر رکھوالیگا اور اندر جانے کے لئے اعزازی ٹکٹ عنایت فرما دیگا۔ اس تنگ مذہبی تصور نے اول تو زندگی کے معاملات پر مذہبی اخلاقیات کے انطباق کو بہت محدود کر دیا ہے جس کی وجہ سے زندگی کے تمام بڑے بڑے شعبے ہر اس اخلاقی رہنمائی اور بندش سے آزاد ہو گئے ہیں جو مذہب سے حاصل ہو سکتی تھی، دوسرے اس تنگ دائرے میں بھی اخلاق کی گرفت سے بچ نکلنے کے لئے ایک راستہ یہاں کھلا ہوا ہے جس سے فائدہ اٹھانے میں کم ہی لوگ سستی دکھلاتے ہیں۔

ان سب سے بہتر حالت جن مذہبی طبقوں کی ہے، جو شرک سے بھی پاک ہیں، سچائی کے ساتھ خدا کو بھی مانتے ہیں، اور آخرت کے متعلق بھی کسی جھوٹے بھروسے پر تکیہ نہیں کر بیٹھے ہیں، اُن کے اندر اخلاق کی پاکیزگی تو بے شک پائی جاتی ہے، اور بہترین سیرت و کردار کے لوگ اُن میں مل جاتے ہیں، لیکن ان کو بالعموم مذہب و روحانیت کے محدود تصور نے خراب کر رکھا ہے۔ وہ دنیا اور اسکے مسائل زندگی سے بڑی حد تک بے تعلق ہو کر یا تو چند مخصوص کاموں کو، جنہیں مذہبی کام سمجھا جاتا ہے لے بیٹھے ہیں، یا اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر صاف کرتے ہیں تاکہ وہ اس دنیا ہی میں عالمِ غیب کی آوازیں سُننے اور حسنِ مطلق کی پرچھائیاں دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کے نزدیک نجات کا راستہ دنیوی زندگی کے کنارے کنارے بچکر نکل جاتا ہے اور خدا کے قرب سے سرفراز ہونیکی سبیل بس یہ ہے کہ ایک طرف مذہب کے دیے ہوئے نقشے پر اپنی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کو ڈھال لیا جائے،

دوسری طرف نفس کی صفائی کے چند طریقوں سے کام لے کر اسے مجلّٰی و مصفّٰی کر لیا جائے، اور پھر ایک محدود دائرے کے اندر کچھ مذہبی و روحانی مشاغل میں مصروف رہ کر زندگی کے دن پورے کر دیے جائیں۔ گویا ان کے خدا کو چند خوش وضع شیشے کے برتن، چند مفطّح لاؤڈ سپیکر، چند عمدہ گراموفون، چند لطیف ریڈیو سیٹ، چند خوشنما فوٹو کے کیمرے درکار تھے اور اسی غرض کے لئے اس نے زمین میں اتنا کچھ سامان دے کر انسانوں کو بھیجا تاکہ یہاں سے اپنے آپ کو ان چیزوں میں تبدیل کر کے پھر اس کے پاس واپس پہنچ جائیں۔ مذہب و روحانیت کے اس غلط تصوّر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ جو نفوس بلند تر اور پاکیزہ تر اخلاقی صلاحیتوں کے حامل تھے انہیں یہ زندگی کے میدان سے ہٹا کر گوشوں میں لے گیا اور گھٹیا درجے کے اخلاقی اوصاف رکھنے والوں کے لئے بغیر مزاحمت کے خود بخود میدان خالی ہو گیا۔

دنیا کی پوری مذہبی صورتِ حالات کا یہ لبّ لباب ہے اور اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خدا پرستی سے جو اخلاقی طاقت انسان کو ملنی ممکن تھی بیشتر انسان تو اس کو سرے سے حاصل ہی نہیں کر رہے ہیں، اور ایک بہت قلیل تعداد اس کو حاصل کر رہی ہے لیکن انسانیت کی رہنمائی و سربراہ کاری سے وہ خود دست بردار ہو گئی ہے اس لئے اس کا حال اس بیٹری کا سا ہے جس میں بجلی بھری جائے اور وہ یونہی رکھے رکھے اپنی عمر پوری کر دے۔

انسانی تمدن کی گاڑی بالفعل جو لوگ اس وقت چلا رہے ہیں اُن کے اخلاقیات خدا اور آخرت کے اساسی تخیل سے خالی ہیں اور دانستہ خالی کیے گئے ہیں، نیز اخلاق میں خدا کی رہنمائی قبول کرنے سے انہوں نے قطعی انکار کر دیا ہے۔ اگرچہ ان میں کثیر التعداد لوگ کسی نہ کسی مذہب کے قائل ہیں مگر اُن کے نزدیک مذہب ہر انسان کا محض ایک شخصی و انفرادی معاملہ ہے جسے اپنی ذات تک آدمی کو محدود رکھنا چاہیئے، اجتماعی زندگی اور اسکے معاملات سے مذہب کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے

پھر اس کی کیا ضرورت کہ وہ اِن معاملات کو چلانے کے لئے کسی فوق الفطری ہدایت کی طرف رجوع کریں۔
گذشتہ صدی کے اواخر میں جب اخلاقی تحریک کی ابتدا امریکہ سے ہوئی تھی اور جو بڑھتے بڑھتے انگلستان اور دوسرے ممالک میں پھیل گئی، اس کا بنیادی مسلک AMERICAN ETHICAL UNION کے مقاصد کی فہرست میں بایں الفاظ واضح کیا گیا تھا:

"انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں، خواہ وہ شخصی ہوں، اجتماعی ہوں، قومی ہوں یا بین الاقوامی، اخلاق کی انتہائی اہمیت پر زور دینا بغیر اس کے کہ مذہبی معتقدات یا مابعد الطبیعی تخیلات کا اس میں کوئی دخل ہو"

اس تحریک کے زیر اثر انگلستان میں UNION OF ETHICAL SOCIETIES قائم ہوئی جو بعد میں ETHICAL UNION میں ضم ہو گئی۔ اس کا اساسی مقصد یہ بیان کیا گیا تھا:

"انسانی رفاقت اور خدمت کے ایک ایسے طریقے کی تلقین کرنا جو اس اصول پر مبنی ہو کہ سب کا سب سے بڑا مقصد بھلائی کی محبت ہے، اور یہ کہ اخلاقی تصورات اور اخلاقی زندگی کے لئے دنیا کی حقیقت اور زندگی بعد موت کے متعلق کسی عقیدے کی حاجت نہیں ہے، اور یہ کہ خالص انسانی اور فطری ذرائع سے انسانوں کو اپنے تمام تعلقاتِ زندگی میں حق سے محبت کرنے، حق جاننے اور حق پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جائے"

ان الفاظ میں درحقیقت اُس پورے طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے جو اسوقت دنیا کے افکار، تہذیب، تمدن اور معاملات کی رہنمائی کر رہا ہے۔ آج دنیا کے کاروبار کو عملاً جو لوگ چلا رہے ہیں ان سب کے ذہن پر وہی تخیل چھایا ہوا ہے جو اوپر کے چند فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔ سب ہی نے بالفعل اپنے اخلاقیات کو خدا اور آخرت کے عقیدے اور مذہب کی اخلاقی رہنمائی سے آزاد کر لیا ہے۔ اب ہمیں ان اخلاقی فلسفوں کا، جنہیں مذہب سے آزاد ہو کر انہوں نے اختیار کیا ہے، جائزہ لے کر دیکھنا چاہیئے کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔

فلسفۂ اخلاق کا پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ اصلی اور انتہائی بھلائی کیا ہے جس کو پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیے اور جس کے معیار پر انسان کے طرزِ عمل کو پرکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ وہ اچھا ہے یا برا، صحیح ہے یا غلط؟

اس سوال کا کوئی ایک جواب انسان نہیں پا سکا۔ اسکے بہت سے جوابات ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک وہ بھلائی خوشی ہے، دوسرے کے نزدیک کمال ہے، تیسرے کے نزدیک فرض برائے فرض ہے۔

پھر خوشی کے متعلق مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کیسی خوشی؟ آیا وہ جو جسمانی و نفسانی خواہشات کے پورا ہونے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو ذہنی ترقی کے مدارج پر چڑھنے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو اپنی شخصیت کو آرٹ یا روحانیت کے نقطۂ نظر سے آراستہ کر لینے سے حاصل ہوتی ہے؟ نیز یہ کہ کس کی خوشی؟ آیا ہر شخص کی اپنی خوشی؟ یا اس جماعت کی خوشی جس سے انسان وابستہ ہے؟ یا تمام انسانوں کی خوشی؟ یا فی الجملہ دوسروں کی خوشی؟

اسی طرح کمال کو مقصود قرار دینے والوں کے لئے بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کمال کا تصوّر اور اس کا معیار کیا ہے؟ اور کمال کس کا مقصود ہے؟ فرد کا؟ جماعت کا؟ یا انسانیت کا؟

اسی طرح جو لوگ فرض برائے فرض کے قائل ہیں اور ایک غیر مشروط واجب الاطاعت قانونِ فرض (CATEGORICAL IMPERATIVE) کی بے چون و چرا اطاعت ہی کو آخری و انتہائی بھلائی قرار دیتے ہیں ان کے لئے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون فی الواقع ہے کیا؟ کس نے اس کو بنایا؟ اور کس کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے؟

ان تمام سوالات کے جوابات مختلف گروہوں کے نزدیک مختلف ہیں۔ محض فلسفہ کی کتابوں ہی میں مختلف نہیں ہیں بلکہ عملاً بھی مختلف ہیں۔ یہ ساری انسانوں کی بھیڑ جو آپکے سامنے تمدنِ انسانی کی گاڑی کو چلا رہی ہے، جس میں سلطنتوں کو چلانے والے وزیر، فوجوں کو لڑانے والے جنرل، انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے والے جج، انسانی معاملات کے لئے قانون بنانے والے شارعین، انسانوں کو تیار کرنے والے معلّم، انسان کے معاشی ذرائع کو کنٹرول

کرنے والے کاروباری لوگ، اور تمدن کے کارخانے میں کام کرنے والے مختلف مدارج کے کارکن، سب ہی شامل ہیں۔ انکے پاس بھلائی کا کوئی ایک معیار نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص اور ہر ایک گروہ اپنا الگ معیار رکھتا ہے اور ایک تمدنی نظام میں کام کرتے ہوئے بھی ہر ایک کا رُخ ایک الگ مقصود کی طرف پھرا ہوا ہے۔ کسی کے نزدیک اپنی خوشی منتہا ہے اور خوشی سے اسکی مراد نفسانی و جسمانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ کوئی اپنی خوشی کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اس سے اسکے ذہن میں کچھ اور مراد ہے۔ اس ذاتی خوشی کے حصول و عدم حصول ہی کے لحاظ سے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اس کیلئے کونسا طرزِ عمل نیک ہے یا بد، مگر اسکی ظاہری شریفانہ صورت سے ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی کیلئے وہ ایک موزوں وزیر یا جج، یا معلّم یا کسی دوسری حیثیت سے تمدن کی مشین کا ایک اچھا پرزہ ہے۔ اسی طرح کوئی خوشی سے مراد انسانوں کے اُس مخصوص مجموعہ کی خوشی و خوشحالی سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسکی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور یہی اسکے نزدیک وہ خیرِ برتر ہے جسکے حصول کی سعی کرنا اسکے نزدیک نیکی ہے۔ یہ نقطۂ نظر اسے اپنے طبقے یا اپنی قوم کے سوا ہر ایک کیلئے سانپ اور بچھو بنا دیتا ہے لیکن ہم اسکی ظاہری مہذب صورت کی وجہ سے اسکو ایک شریف انسان فرض کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی مختلف اقسام کی شخصیتیں کمال کو خیرِ اعلیٰ جاننے والوں اور فرض برائے فرض کے قائلین میں پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر کے نظریات اپنے عملی نتائج کے اعتبار سے انسانی تہذیب و تمدن کے لئے زہر کا حکم رکھتے ہیں مگر وہ تریاق کا لیبل لگائے ہوئے ہماری اجتماعی زندگی میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اب آگے چلیے۔ فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ کس ماخذ کی طرف ہم یہ معلوم کرنے کیلئے رجوع کریں کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا، صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟

اس سوال کا بھی کوئی ایک جواب انسان کو نہیں ملا۔ اسکے بھی بہت سے جوابات ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ذریعہ اور ماخذ انسانیت کا تجربہ ہے، کسی کے نزدیک قوانینِ حیات اور حالاتِ وجود کا علم ہے، کسی کے نزدیک وجدان ہے، کسی کے نزدیک عقل ہے۔ یہاں پہنچکر وہ بدنظمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جس کا آپ نے پہلے سوال کے معاملہ میں مشاہدہ کیا۔ ان چیزوں کو ماخذ قرار دینے کے بعد اخلاق کے لئے مستقل اصول ہی یہ قرار پا جاتا ہے کہ اس کا کوئی متعین معیار

نہ ہو بلکہ وہ ایک سیّال مادّے کی طرح بہتا اور مختلف صورتوں اور پیمانوں میں ڈھلتا چلا جائے۔

انسانیت کے تجربے سے صحیح علم حاصل کرنے کیلئے ناگزیر ہے کہ اسکے متعلق مکمل اور مفصل معلومات یکجا جمع ہوں اور کوئی ہمہ بیں اور کامل متوازن ذہن ان سے نتائج اخذ کرے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں حاصل نہیں ہیں۔ اوّل تو انسانیت کا تجربہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے۔ پھر اب تک کا جو تجربہ ہے اسکے بھی مختلف اجزاء مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور وہ مختلف طور پر اپنی ذہنیت کے مطابق ان سے نتائج نکال رہے ہیں۔ تو کیا ان ناقص معلومات سے مختلف نامکمل ذہن اپنے رجحانات کے مطابق جو نتائج بھی اخذ کرلیں وہ سب صحیح ہوسکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو کیسے سخت بیمار ہیں وہ ذہن جو اپنے خیر و شر کو جاننے کے لئے اِس ذریعۂ علم کو کافی سمجھتے ہیں۔

یہی معاملہ قوانینِ حیات اور حالاتِ وجود کا ہے۔ یا تو آپ اخلاقی بھلائی اور برائی کو جاننے کیلئے اُسوقت کا انتظار کریں جب اِن قوانین اور حالات کا علم قابلِ اطمینان حد تک آپکی گرفت میں آجائے، یا نہیں تو ناکافی معلومات کو ناکافی جانتے ہوئے انہی کی بنیاد پر مختلف ذہنیت اور مختلف مراتبِ علمی کے لوگ مختلف طور پر فیصلے کرتے رہیں کہ اُن کیلئے خیر کیا ہے اور شر کیا، اور علم کی ہر نئی قسط حاصل ہونیکے بعد ان فیصلوں کو بدلتے بھی رہیں حتیٰ کہ آج کا خیر کل شر ہوجائے اور آج کا شر کل خیر قرار پائے۔

عقل اور وجدان کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ بلاشبہ خیر و شر کو جاننے کی کچھ استعداد عقل کو بھی حاصل ہے اور اس عقل سے ہر انسان نے کچھ نہ کچھ حصّہ پایا ہے، اور خیر و شر کا کچھ علم وجدانی بھی ہے جس کا الہام ہر انسان کے ضمیر پر فطرۃً ہوتا ہے، لیکن اس علم کیلئے اِن میں سے کوئی بھی کافی بالذات نہیں ہے کہ اسی کو آخری اور واحد ذریعۂ علم کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ عقل یا وجدان، جس کو بھی آپ کافی بالذات سمجھیں گے، بہرحال ایک ایسے ذریعۂ علم پر آپ اعتماد کریں گے جو نہ صرف یہ کہ اپنی فطرت میں ناقص و محدود ہے، بلکہ وہ مختلف اشخاص، مختلف طبقوں، مختلف حالات اور مختلف زمانوں میں پہنچکر بالکل مختلف چیزوں پر خیر یا شر ہونے کا حکم لگاتا ہے۔

یہ ساری بدنظمی جس کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، محض علمی مقالات اور فلسفیانہ بحثوں تک ہی

محدود نہیں ہے بلکہ فی الواقع دنیا کے تمدن و تہذیب میں عملاً اس کا عکس پوری طرح نمایاں ہو رہا ہے۔ آپ کے تمدن میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، خواہ وہ کارفرمائی کے مقام پر ہوں یا کارکنی کے مقام پر، یا کارفرماؤں اور کارکنوں کے بنانے میں لگے ہوتے ہوں، یہ سب خیر و شر اور صحیح و غلط کو جاننے کے لئے اپنے اپنے طور پر انہی مختلف ماخذوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں؛ اور ہر شخص اور ہر گروہ کا خیر و شر دوسرے کے خیر و شر سے الگ ہے، حتیٰ کہ ایک کا خیر دوسرے کا انتہائی شر ہے اور ایک کا شر دوسرے کا انتہائی خیر۔ اس بدنظمی نے اخلاق کیلئے کوئی پائیدار بنیاد باقی ہی نہیں رہنے دی ہے۔ جن چیزوں کو دنیا ہمیشہ سے شرمناک بداخلاقی سمجھتی آئی ہے یا جنہیں ہمیشہ سے جرم اور گناہ سمجھا جاتا رہا ہے آج کسی نہ کسی گروہ کی نگاہ میں وہ عین خیر ہیں یا مطلقاً خیر نہیں تو اضافی خیر بن گئی ہیں۔ اسی طرح جن بھلائیوں کو ہمیشہ سے انسان خوبی سمجھتا رہا ہے ان میں سے اکثر آج حماقت اور مضحکہ قرار پا چکی ہیں اور مختلف گروہ ان کو شرم کے ساتھ نہیں بلکہ فخر کے ساتھ علانیہ پامال کر رہے ہیں۔ پہلے جھوٹا جھوٹ بولتا تھا مگر معیارِ اخلاق سچائی ہی کو مانتا تھا۔ لیکن آج کے فلسفوں نے جھوٹ کو خیر بنا دیا ہے اور جھوٹ بولنے کا ایک مستقل فن مدوّن کیا جا رہا ہے اور بڑے پیمانے پر قومیں اور سلطنتیں جھوٹ پھیلا رہی ہیں۔ یہی حال ہر بداخلاقی کا ہے کہ پہلے بداخلاقیاں، بداخلاقیاں ہی تھیں مگر آج نئے فلسفوں کے طفیل میں وہ سب مطلق یا اضافی خیر میں تبدیل کر دی گئی ہیں۔

فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے تیسرا سوال یہ ہے کہ قانونِ اخلاق کے پیچھے وہ قوت کونسی ہے جس کے زور سے یہ قانون نافذ ہو؟ اس کے جواب میں مسرت اور کمال کے پرستار کہتے ہیں کہ خوشی یا کمال کی طرف لے جانے والی بھلائیاں اپنی پیروی کرانے کی طاقت آپ رکھتی ہیں اور رنج یا پستی کی طرف لے جانے والی برائیاں آپ اپنے ہی زور پر اپنے سے اجتناب کرا لیتی ہیں۔ اس کے سوا قانونِ اخلاق کے لئے کسی خارجی اقتدار کی ضرورت ہی نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قانونِ فرض انسان کے ارادۂ معقول کا اپنے اوپر آپ عائد کردہ قانون ہے، اس کے لئے کسی بیرونی زور کی حاجت نہیں۔ تیسرا گروہ سیاسی اقتدار کو قانونِ اخلاق کی اصل قوتِ نافذہ سمجھتا

ہے اور اس مسلک کی رُو سے اسٹیٹ کی طرف وہ تمام اختیارات منتقل ہو جاتے ہیں جو پہلے خدا کے لئے تھے، یعنی باشندوں کے حق میں یہ فیصلہ کرنا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ چوتھے گروہ نے یہ مرتبہ اسٹیٹ کے بجائے سوسائٹی کو دیا ہے۔ یہ سب جوابات فساد کی بے شمار صورتیں دنیا میں عملاً پیدا کر چکے ہیں اور اب تک کر رہے ہیں۔ پہلے دونوں جوابوں نے انفرادی خودسری و بے راہ روی یہاں تک بڑھا دی کہ اجتماعی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کا ردِ عمل اُن فلسفوں کی صورت میں رونما ہوا جنہوں نے یا تو اسٹیٹ کو خدا بنا کر افراد کو بالکل اس کا بندہ بنا ڈالا، یا پھر افراد کی روٹی کے ساتھ ان کے خیر و شر کی باگیں بھی اجتماع کے ہاتھوں میں دیدیں، حالانکہ سبوح و قدوس نہ اسٹیٹ ہے نہ اجتماع۔

یہی معاملہ اس سوال کے جواب میں پیش آتا ہے کہ وہ کونسا محرک ہے جو انسان کو اپنے طبعی رجحانات کے علی الرغم اخلاقی احکام کی پابندی پر آمادہ کرے؟ کسی کے نزدیک بس خوشی کی طمع اور رنج و تکلیف کا خوف اس کیلئے کافی محرک ہے۔ کوئی محض کمال کی خواہش اور نقص سے بچنے کی تمنا کو اس کے لئے کافی سمجھتا ہے۔ کوئی اس کے لئے محض آدمی کے اپنے جذبۂ احترام قانون پر اعتماد کرتا ہے۔ کوئی اسٹیٹ کے اجر کی امید اور اسکے غضب کے خوف کو اہمیت دیتا ہے۔ اور کوئی اجتماع کے اجر اور اسکے غضب کو طمع و خوف کے لئے استعمال کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ ان میں سے ہر جواب نے عملاً ہمارے اخلاقی نظامات میں سے کسی نہ کسی کے اندر تقدم کا مقام حاصل کیا ہے، اور تھوڑا سا تجسس کرنے پر یہ حقیقت باآسانی کھل سکتی ہے کہ یہ سب محرکات بداخلاقی کے لئے بھی اتنے ہی اچھے محرک بن سکتے ہیں جتنے خوش اخلاقی کے لئے۔ بلکہ ان میں بداخلاقی کے لئے محرک بننے کی قوت بہت زیادہ ہے۔ اور بہرحال کسی اعلیٰ درجہ کی اخلاقیت کے لئے تو یہ تمام محرکات قطعاً ناکافی ہیں۔

یہ بہت مختصر جائزہ جو میں نے دنیا کی موجودہ اخلاقی حالت کا لیا ہے اس سے بیک نظر یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اسوقت ایک ہمہ گیر اخلاقی انتشار پایا جاتا ہے۔ خدا سے بے نیاز ہو کر انسان کوئی ایسی بنیاد نہیں پا سکا جس پر وہ قابلِ اطمینان طریقہ سے اپنے اخلاق کی تعمیر کرتا۔ اخلاق کے سارے بنیادی سوالات اس کے لئے

حقیقتاً لاجواب ہو کر رہ گئے۔ نہ وہ اُس خیر و برتر کا کہیں سراغ لگا سکا جو اس کی کوششوں کا منتہا بننے کے قابل ہوتا اور جس کے لحاظ سے اعمال کے نیک یا بد اور صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا۔ نہ اُسے وہ ماخذ کہیں ہاتھ لگا جس سے وہ صحیح طور پر معلوم کر سکتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا۔ نہ اُسے وہ اقتدار فراہم کرنے میں کامیابی ہوئی جس کے امضاء (SANCTION) سے اخلاق کے کسی بلند، جامع اور عالمگیر ضابطہ کو قوت نفاذ حاصل ہوتی۔ اور نہ اسے کوئی ایسا محرک مل سکا جو انسانوں میں راستی پر عمل کرنے اور ناراستی سے پرہیز کرنے کے لئے حقیقی آمادگی پیدا کرنے کے قابل ہو۔ خدا سے بغاوت کر کے انسان نے خود سری کے ساتھ ان سوالات کو حل کرنا چاہا اور اپنے نزدیک حل کیا بھی، مگر یہ اسی حل کے پیدا کردہ نتائج ہیں جو آج ہم کو اخلاقی تنزل کے ایک خوفناک طوفان کی شکل میں اٹھتے اور پوری انسانی تہذیب کو تباہی کی دھمکیاں دیتے نظر آ رہے ہیں۔

کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اس بنیاد کو تلاش کریں جس پر انسانی اخلاق کی صحیح تعمیر ہو سکے؟ فی الواقع یہ تلاش و جستجو محض ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے اور وقت کی نزاکت نے اس کو اہم ترین ضرورت بنا دیا ہے۔ اسی لحاظ سے میں اپنی تلاش کے نتائج پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں وہ نہ صرف میرے ان نتائج پر ٹھنڈے دل سے غور کریں بلکہ خود بھی سوچیں کہ اخلاقِ انسانی کے لئے آخر کونسی بنیاد صحیح ہو سکتی ہے۔ (باقی آئندہ)

کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

یہ اس کتاب کا ایک باب ہے جو مولانا امین احسن صاحب نے "حقیقت شرک" کے نام سے حال میں تصنیف فرمائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عنقریب شائع ہو جائے گی۔

اس زمانہ میں ہر علم وفن کی تحقیق میں نظریۂ ارتقاء ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تاریخ ہو یا قانون، معاشیات ہو یا سیاسیات، فلسفہ و مذہب ہو یا علم عمران و تمدن، ہر ایک کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کا شوق اس عہد کے ذوق پر اس درجہ غالب ہے کہ اسکے بغیر ہر علم ادھورا اور ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر علم کا مدوّن سرمایہ، جو پوری روشنی میں موجود ہے، اپنی صحیح قدر و قیمت بتانے کے لئے بالکل ناکافی بلکہ اکثر حالات میں غلط اور مہمل قرار دیدیا گیا ہے۔ آج اصل شئے یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اُس عہد میں تحقیق کی جائے جبکہ انسان بالکل عہد طفولیت میں تھا اور جسکی کوئی لکھی ہوئی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہد ایک عہد ظلمت ہے۔ اسکے متعلق جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے اسکی حقیقت رجماً بالغیب باتوں اور اٹکل کے تیر تکوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس ظلمات میں خضر راہ آرکیالوجی (علم الاثار) اور بیالوجی (علم الحیوۃ) کے ماہرین ہیں جو زمین کے طبقات، چٹانوں کے پرتا غاروں کے اندر کے آثار و علامات، گڑی ہوئی ہڈیاں، ابتدائی آلات و اوزار، اور قدیم انسان کے کھینچے ہوئے آڑے ترچھے نقوش کو علم کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور اس پر ظن و تخمین کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ اسکی حیثیت ظن و تخمین (GUESS WORK) سے زیادہ نہیں ہے۔ تاہم اسکی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ہر علم و فن میں وہی حقیقت ہے جو ان مظنونات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ جو بات ان سے میل نہ پیدا کر سکے وہ بے اصل اور ارتقاء کی راہ میں گویا ایک غیر فطری بیرونی مداخلت ہے جس کا وجود نہیں بلکہ عدم

مطلوب ہے۔ اس خیال کے غلبہ کا یہ اثر ہے کہ ایک عرصے دنیا میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے جتنے دعوے اُبھرے ہیں ان میں سے ہر دعوی کو نظریہ ارتقاء کا سہارا لینا پڑا ہے۔ اور یہ اتنا مرغوب رجحان مریخ واقع ہوا ہے کہ سب کے ساتھ اسکی سازگاری رہی۔ جمہوریت کے حامیوں نے انسان کی ابتدائی سماجی زندگی کا نقشہ اس طرح پیش کیا کہ جمہوریت ہی کو انسان کا فطری تقاضا ثابت کر دیا۔ ملوکیت کے ہمدردوں نے اس کی تقریر اپنے رنگ میں کر ڈالی، مزاج کے علمبرداروں نے اسکی تصویر اپنے رنگ میں کھینچدی۔ اشتراکیت نے اس کو اپنے رنگ میں پیش کر دیا صرف غریب مذہب اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کلیسا سے، پہلے ہی مرحلہ میں، اس نظریہ کے علمبرداروں سے ان بن ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکے شاطر حامیوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح بھی اس کو ان مذاہب کی حمایت میں نہ استعمال کیا جاسکے جو اپنی مخصوص انفرادیت کے مدعی ہیں اور اپنے عقائد و مسلمات کی بنیاد وحی پر قرار دیتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے ساتھ کسی رواداری کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی جڑ اکھاڑنے کی انہوں نے پوری کوشش کی اور اس مقصد کے لئے مذہب کے ارتقاء کو انہوں نے اس طرح پیش کیا جس سے آسمانی مذاہب کے تمام مسلمات بالکل ڈھے جائیں۔

۔ اس مضمون میں مسئلہ کی تمام تفصیلات سے ہمیں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف اتنے حصہ سے تعرض کرینگے جس کا تعلق شرک و توحید سے ہے۔

یہ لوگ مذہب کے ارتقاء کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ مذہب نے انسان کے اولین نقش قدم کے ساتھ دنیا میں قدم رکھا۔ جس وقت انسان نے یہ محسوس کیا کہ وہ مجرد جسم نہیں ہے بلکہ اپنے اندر اس سے ایک برتر عنصر روح بھی رکھتا ہے اسی وقت مذہب کی پہلی بنیادی اینٹ رکھ دی گئی۔ اس کی ابتدائی تشکیل دو عنصروں سے ہوئی۔ ایک جذبہ خوف دوسرا تصوّر۔ خوف اَن دیکھی قوتوں کا جو قدرت کی ان طاقتوں سے پیدا ہوا جو انسان سے زور و قوت میں بڑھکر تھیں اور ہر چہار طرف سے اس کو گھیرے ہوئے تھیں اور تصوّر، اس بات کا کہ ان کی تعظیم اور بندگی کرنی چاہیے۔ جس طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ، جو جسم و جسمانیات سے تعلق رکھتی ہیں، زندگی کے اس ابتدائی

ذرہ سے وابستہ ہے جس نے مادہ کو زندگی کی حرکت بخشی اسی طرح اُن تمام چیزوں کی تاریخ، جو روح و روحانیات سے وابستہ ہیں، اس ذرہ روح سے متعلق ہے جس کے جذبہ خوف اور تصور کے باہمی تفاعل سے مذہب وجود میں آیا ہے۔ اس مذہبی تصور نے جب مذہبی عمل کی صورتیں اختیار کیں تو اسکے نتیجہ کے طور پر مذہب کے فرائض اور اسکے رسوم و مناسک وجود میں آئے۔ پس مذہب ایک عمل ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کا ارتقاء تھا۔ یہ روح کا ارتقاء ہے۔ اور جس طرح یہ بات معلوم ہے کہ زندگی ایک زمانہ میں رینگنے والے جانوروں کی شکلوں (REPTILION LIFE FORMS) میں چھپی ہوئی تھی اور درجہ بدرجہ انسان کی اس احسن تقویم میں بے نقاب ہوئی، اسی طرح روح ابتدا میں مظاہر پرستی، اشیاء پرستی اور سحر و ساحری کی زنجیروں میں گرفتار تھی اور آہستہ آہستہ خالص خدا پرستی تک پہنچی۔

اس تقریر سے جو نتائج وہ نکالتے ہیں وہ بھی ہم اپنے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔

۱۔ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ یہ خوف مظاہر قدرت سے پیدا ہوا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آندھیوں کے شور، آتش فشاں پہاڑوں کے ہولناک نظاروں نے انسان کو ڈرایا اور وہ ان کو زندہ وجود سمجھ کر ان کی آفتوں سے اپنے تئیں بچانے کے لئے ان کی عبادت کرنے لگا۔

۲۔ خالص خدا پرستی کے تقاضائے فطرت ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا پرستی کی جگہ انسان مظاہر پرستی اور اشیاء پرستی وغیرہ سے پہلا قدم نہ اٹھاتا اور نہ دنیا میں بت پرستی اور مردہ پرستی کی یہ کثرت ہوتی۔

۳۔ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اس اعتبار سے اسلام اور یہودیت اور افریقہ کے وحشیوں کی سحر پرستی (VOODOO WORSHIP) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پس تمام مذاہب اور عقائد مختلفہ میں رواداری کو اصل الاصول ہونا چاہیے۔

اوپر کی تقریر اس قدر دلکش تھی کہ ان نتائج کا لحاظ کئے بغیر، اس نے ہمارے حال کے بعض علمائے دین کی کتابوں میں بھی جگہ پالی۔ حالانکہ یہ بالکل مہمل اور غلط ہے۔ عقل و نقل دونوں اسکے خلاف ہیں۔

یہ بات کہ مذہب کا آغاز اَن دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا بالکل بے سر و پا ہے۔ انسان میں جو خوف ہے

اس کی اصل حقیقت زوال نعمت کا اندیشہ ہے۔ (چنانچہ اہل جنت کو یہ نعمت حاصل ہو گی کہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون نہ ان کو زوال نعمت کا اندیشہ ہو گا نہ فائت کا غم) اس لئے خوف سے پہلے نعمت اور منعم کا شعور ناگزیر ہے جب تک ہمیں زندگی اور اس کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک ہمیں زندگی کے متعلق کوئی خوف نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں وہ موت جیسی خوفناک چیز سے بھی نہیں ڈرتے۔ کتنے آدمی آگ میں کود پڑتے ہیں، کتنے دریاؤں اور سمندروں میں ڈوب مرتے ہیں اور جاپان میں کتنے ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں چھلانگ لگا کے ختم ہو جاتے ہیں۔ پس اگر ابتدائی انسان کو بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور طوفانوں کے شور سے کوئی خطرہ محسوس ہوا اور اسے اپنے تئیں انکے خطرات سے بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو اس سے لازم آتا ہے کہ اسے زندگی اور زندگی کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا شعور تھا کیونکہ جب تک کوئی شے عزیز نہ ہو اس کی حفاظت کی فکر بالکل بے معنی ہے۔ خالی گھر میں کوئی بھی قفل نہیں لگاتا۔ اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اسے ایک منعم کا بھی شعور تھا کیونکہ نعمت کا وجود ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے۔ اور اگر یہ بات بھی ہے کہ وہ قدرت کے ان مظاہر کی اس ڈر سے عبادت کرنے لگا کہ وہ اس سے کہیں زندگی کی نعمت یا اسکے اسباب چھین نہ لیں تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان نعمتوں کے شعور نے اس میں اپنے منعم کے لئے محبت کا جذبہ بھی پیدا کیا ہو گا۔ پس ثابت ہوا کہ ایک منعم کی محبت کا جذبہ خوف کے جذبہ پر مقدم ہے

بہرحال انسان نے جب سے خوف کا احساس کیا اس سے پہلے زندگی کے نعمت ہونے اور ایک منعم کا اور اس کی محبت کا احساس کیا۔ اور جس وقت اسکے تصور نے ورغلایا کہ ان مظاہر قدرت کی عبادت کرے یقیناً اس سے پہلے جذبہ محبت سے ایک تصور نے ابھر کر اسے اُکسایا ہو گا کہ وہ اپنے منعم کا شکر کرے اور لاریب یہی محبت اور شکر گذاری کا جذبہ و تصور توحید اور خالص خدا پرستی کی اصل ہے۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید نے حمد و شکر کو انسان کی اولین صدائے فطرت بتایا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم۔

اس بات کی تائید اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں

وہ دنیا کے عامۃ الورود واقعات میں سے نہیں ہیں۔ زلزلے روز نہیں آتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روزانہ نہیں کڑکتیں اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں ہے۔ لیکن تارے روز چمکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، آسمان کی نیلگونی ہر لحظہ باصرہ نواز ہے۔ چاند روپہلی چاندنی کی چادر، دشت و جبل میں روز بچھاتا ہے، ابرِ کرم کی تر دستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہرِ قدرت کی گاہ گاہ کی گھڑکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعمِ غیب کی یہ سب فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جائیں اور انسان میں شکر و سپاس کا کوئی ولولہ نہ پیدا کریں۔

بیالوجی کے علماء نے اس زمانہ کی دنیا کی تصویر بہت بھیانک کھینچی ہے اور دکھانا چاہا ہے کہ اس وقت کے قدرتی مظاہر خوف کے جذبہ ہی کا باعث ہو سکتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس زمانہ کا انسان بھی آج کا انسان نہ تھا۔ اگر اس وقت یہ کائنات اتنی حسین نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی اتنا جمال پرست نہ تھا۔ اگر اس وقت یہ زمین آج کی طرح زرخیز و معمور نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی آج کی طرح عشرت پسند اور مجلس نواز نہ تھا۔ اگر اس وقت خطرے بے شمار تھے تو آج کے انسان کی طرح اس عہد کا انسان نازک بدن اور تن آسان بھی نہ تھا۔ وہ ہر خطرے سے بچاؤ کے لئے کوسوں بھاگ سکتا تھا، گلہریوں اور بندروں کی سی چستی کے ساتھ درختوں پر چڑھ سکتا تھا، آگ جلا کر اور تپتے سی کر اپنے جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچا سکتا تھا، برف اور درندوں کی آفتوں سے بچنے کے لئے غاروں میں چھپ سکتا تھا، بھوک میں ہر جانور کے شکار سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس لئے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس وقت کے حالات خوف ہی کے جذبہ کی نشوونما کے لئے سازگار تھے۔ اس میں حاضر کو ماضی میں داخل کر دینے کا مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ زمانہ قدیم ترین دورِ حجری سے بھی پہلے کا فرض کیا گیا ہے اور انسان اس کے اندر اس بیسویں صدی کا فرض کر لیا گیا ہے۔ بہرحال ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ انسان کے اندر جب بھی خوف کا جذبہ پیدا ہوا اس سے پہلے ایک منعم کی محبت کا جذبہ ضرور اس کے اندر موجود تھا۔

بعض علمائے ارتقاء نے خاندان کے بڑے بوڑھے کے خوف کو انسان کے تمام ابتدائی تصورات (EARLY

(THOUGHTS) کی اصل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بالکل غلط ہے۔ باپ کے خوف کی بنیاد ضرر رسانی کے اندیشہ پر نہیں ہے۔ اس کی بنیاد بھی محبت ہی پر ہے۔ بچوں کو تمام لذتیں اور راحتیں ماں باپ سے حاصل ہوتی ہیں اسی وجہ سے وہ اُن سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس محبت ہی کی وجہ سے ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ اس باب خاص میں قدیم ترین انسان اور جدید ترین انسان میں فرق کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ پس یہ جذبہ بھی درحقیقت محبت ہی کا جذبہ ہے۔ اور اس سے بلاشبہ ماں باپ کی تعظیم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظرانداز نہیں کرنی چاہیئے کہ بچہ جب تک بچہ رہتا ہے اسی وقت تک ساری کائنات باپ ہی کو سمجھتا ہے۔ لیکن جوں ہی وہ خود باپ بنتا ہے یا بننے کے قابل ہوتا ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ باپ کا وجود صرف ایک حد تک ہی اس کی لذتوں اور راحتوں کا کفیل ہے۔ اس حد سے باہر قدم رکھنے کے بعد اسے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کا سرچشمہ کوئی اور ہی اَن دیکھی ہستی ہے۔ یہاں تک کہ خود باپ کا وجود بھی اسے اس اَن دیکھی ہستی کی بے پایاں بخشایشوں میں سے ایک بخشش معلوم ہونے لگتا ہے۔ پس جس جذبہ محبت نے اسکے اندر باپ سے محبت، تعظیم اور خوف کی وابستگی پیدا کی ہوگی ** اگر انسان ہمیشہ بچہ ہی رہتا اور مذہب کا وجود اسی کے جذبہ محبت اور تفاعل کا نتیجہ ہوتا تب تو دین کا آغاز پدر پرستی ہی سے ہوتا لیکن مشکل تو یہ ہے کہ بچہ سیانا بھی ہوتا ہے اور مذہب کی ایجاد سیانوں ہی کی کارفرمائی ہو سکتی ہے تو سیانوں کے جذبہ اور تصور کا بھی کچھ نتیجہ ہونا چاہیئے۔ بہرحال باپ کے احسانات کا اثر اگر محبت کے جذبہ کی شکل میں اُبھر سکتا تھا اور اس سے اس کی تعظیم، اس کے وقار اور اس کے احترام کا تصور پیدا ہو سکتا تھا تو اس سے بدرجہا اقرب ہے کہ ان عظیم احسانات کا اثر بھی اسی جذبہ و تصور کی شکل میں ہو، جن میں باپ کو کوئی دخل نہیں تھا لیکن وہ موجود تھے اور باپ سے کہیں بڑھکر کسی مہر و محبت والی ہستی ہی کے ہو سکتے تھے[1]

** لازماً اسی جذبے نے، بچپنے کے حدود سے نکلنے کے بعد ایک اَن دیکھی ہستی کے ساتھ محبت، تعظیم اور خوف کی وابستگی بھی پیدا کی ہوگی۔

[1] مذہب کی اصل کے متعلق علمائے سائنس کے ہاں مقبول عام نظریے یہی دو ہیں اور انہی کو نسبتاً علمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسی وجہ سے ہم نے بھی ان ہی دونوں سے تعرض کیا ہے۔ ورنہ اسکے علاوہ اور بھی نظریات ہیں مثلاً بعضوں نے مذہب کا نقطہ آغاز طوطمیت (TOTEMISM) کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی اصل اول اول انسان پر کسی نشیلی چیز کے استعمال کے وجد انگیز اثر کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی بنیاد جنسی خواہشوں پر رکھی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ خرافات محتاج تردید نہیں

بہر حال مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ سے نہیں ہوا، محبت کے جذبہ سے ہوا ہے۔ علمائے ارتقاء کے یہ دونوں نظریے باطل ہیں۔ پہلی صورت میں خالص خدا پرستی کا جذبہ اور تصوّر مقدم ہے اور غیر اللہ کی پرستش ایک غیر فطری عارض کی طرح انسان کو محض سوء فہم اور اپنی فطرت کی صحیح آواز سے غفلت کی وجہ سے لاحق ہو گئی اور دوسری صورت میں یہ ہونا چاہیے کہ انسان باپ کی محبت کا ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہنچ جائے اس کے اس جذبہ کا فطری ارتقاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ باپ سے مستغنی ہونے کے ساتھ ہی مجازی باپ سے حقیقی خالق تک پہنچ جائے اور اس کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت کرے اور باپ سے زیادہ اس کی تعظیم بجا لائے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو وہ ارتقاء کی اصلی شاہراہ پر مارچ کرنے کے بجائے کسی اندھی گلی (BLIND ALLEY) میں جا پڑا اور یہ اسی طرح کا غیر فطری جمود ہے جس کی مثالیں مادی زندگی کے ارتقاء میں ملتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ قدیم ترین جذبہ والدین کی محبت کا جذبہ اور قدیم ترین تصوّر والدین کی تعظیم کا تصوّر ہے اس جذبہ کی رہنمائی بچہ کو بلوغ کے بعد خدا کی طرف لے جاتی ہے۔ نہ کہ آبا پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور تورات میں خدا کی عبادت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت میں خدا اور والدین کے حقوق کا شعور قدیم ترین ہے۔ اور ان میں خدا کا حق والدین پر مقدم ہو جاتا ہے اگرچہ شعور میں والدین کا حق پہلے آتا ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے بالاخانے پر چڑھنے سے پہلے زینہ اوپر ہوتا ہے لیکن اس پر پہنچ جانے کے بعد زینہ نیچے ہو جاتا ہے۔ خدا تک پہنچ جانے کے بعد انسان پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ والدین خود خدا کے افضال میں سے ہیں ان کا پوجنا تو درکنار اس نعمت کے ملنے پر بھی خدا ہی کا شکر واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے والدین کے لئے بیٹے پر تمام حقوق تسلیم کئے لیکن ان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ بیٹے سے شرک کرائیں (وان جاھدٰک علیٰ ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما) اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کے اندر جو داعیہ

حقوق والدین کے احترام اور ان کی محبت و تعظیم کے لئے ہے اس سے قوی تر داعیہ اللہ اور اسکے حقوق کے احترام کے لئے ہے پس والدین کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ جس جذبہ و تصور سے وہ ایک چیز پاتے ہیں بعینہٖ اسی جذبہ و تصور کے اس سے قوی تر مقتضے کا خدا کے باب میں انکار کرائیں۔

بعض لوگوں کو ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں جگہ جگہ اہلِ ایمان کی تعریف میں تقویٰ، خشیت اور خوف کا ذکر آتا ہے۔ اس سے علمائے ارتقار کی اس بات کی تائید نکلتی ہے کہ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ لیکن یہ شبہ بالکل غلط ہے۔ اسلام میں وہ خوف و خشیت معتبر نہیں ہے جس کی بنیاد مجرد ضرر رسانی کے اندیشہ پر ہو۔ اس طرح کی خشیت چنگیز، تیمور، شیر، ہاتھی، سانپ، بچھو ہر ایک سے ہو سکتی ہے۔ اگر یہ خشیت خدا سے ہو تو اسکی کیا وقعت ہے۔ مذہب میں جو خوف و تقویٰ مطلوب و محبوب ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ وہ خوف و تقویٰ ہے جس کی بنیاد محبت پر ہے۔ یہ مجرد خدا کے قہر و غضب کے تصور سے نہیں بلکہ اسکے بے پایاں افضال و عنایات کے تصور اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے تذکر سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اس کی اعلیٰ صفتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں وہی اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہی اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ (اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں)

اس تقریر سے علمائے ارتقار کے اس نظریہ کی پوری تردید ہو گئی کہ مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ اور مظاہر پرستی سے ہوا لیکن ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت خالص خدا پرستی ہے اور اسکے روحانی ارتقار کا رخ یہی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا میں کثرت سے شہادت بت پرستی، مردہ پرستی وغیرہ ہی کی ملتی ہے۔ تاریخ کے عہدِ ظلمت کے آثار و قرائن بھی اسی کی گواہی دیتے ہیں اور جس عہد کا مدوّن سرمایہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ نصاریٰ پر پوری چھ صدیاں بھی نہ گذرنے پائیں کہ ان میں تصویر پرستی رائج ہو گئی حالانکہ تورات میں اسکی سخت ممانعت تھی۔ یہود باوجودیکہ تورات

کا پہلا حکم توحید تھا، بار ہا دل کھول کر بتوں کو پوجنے لگے۔ حضرت ابراہیمؑ نے محض توحید کے لئے وطن کو چھوڑا اور ایک سنسان جگہ جا بسے لیکن انہی کی اولاد نے، بہت مدت نہیں گذری کہ اسی گھر میں بتوں کو لا بسایا جس کا معمار وہ پہلا بت شکن تھا جبکہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خالص توحید ہی انسان کی فطرت ہے لیکن واقعات کی شہادت اسکے خلاف ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہے اور اسی جواب سے علمائے ارتقاء کے اس دوسرے نتیجہ کی تردید ہو جائے گی جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

یہ بات کہ دنیا میں ابتدا سے، کثرت بت پرستی اور شرک کی رہی ہے اور اب تک ہے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ شرک و بت پرستی انسان کی فطرت ہے۔ آدمی کا بچہ جب تک بچہ ہوتا ہے، سامنے کی ہر چیز بلا امتیاز اسکے کہ وہ اینٹ ہے یا پتھر، لکڑی ہے یا لوہا، پاک ہے یا ناپاک، اس کو منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ ماں کی چھاتی ہے۔ کچھ دیر تک اس کو چوستا ہے۔ پھر کوئی دوسری چیز اٹھا لیتا ہے، تیسری چیز اٹھا لیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ ساری چیزیں بچہ کو فطرۃً مطلوب ہیں محض حماقت ہے۔ بچہ کی فطری غذا ماں کی چھاتی کے اندر ہے اور اسی کی تلاش میں اسکی یہ ساری تگ و دو بھی ہے لیکن چونکہ ابھی اسکے اندر پورا امتیاز نہیں ہوتا وہ ہر چیز کو ماں کی چھاتی ہی خیال کرنے لگتا ہے۔ پس اگر انسان اپنے عہدِ طفولیت میں بت پرستی اور مظاہر پرستی وغیرہ کی نجاستوں میں آلودہ رہا تو اسکے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہی اسکی فطرت کا تقاضا تھا۔ درحقیقت اسکی یہ ساری پریشانی و سرگردانی معبود حقیقی کی تلاش میں تھی جس کی طلب نے اسکو ان تمام کوچوں کی خاک چھنوائی۔ بچہ کی یہ خصوصیت بھی قابل لحاظ ہے کہ بسا اوقات ماں اسکو پکارتی بھی ہے لیکن وہ جس چیز میں مشغول رہتا ہے اسی میں مشغول رہتا ہے تا آنکہ وہ اسے گود میں نہ اٹھا لے اور اپنی چھاتی اسکے منہ سے نہ لگا دے پھر جوں ہی اس کو سینہ سے الگ کر دیتی ہے وہ ہر چیز منہ میں ڈالنے اور نگلنے لگتا ہے۔

پس یہ بات بالکل مطابق عقل معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ کے عہدِ ظلمت میں بھی خدا کے ایسے بندے آئے جن کی فطرت بیدار تھی اور انہوں نے دوسروں کو بھی بیدار کیا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد جیسا کہ بچوں کی فطرت ہے،

کھلونوں کی دلچسپی عود کرتی رہی۔ اور انسان کی جستجو اپنا مدعا پا پا کے کھوتی رہی ۔

یہاں پہنچکر بعض لوگوں کو ایک اور شبہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو چیز انسان کی فطرت ہے چاہیے کہ وہ اسی پر پیدا ہو، اسی پر بڑھے اور اسی پر مرے۔ یہ پا پا کر کھونا اور کھو کھو کے پانا کیا معنی! کم ازکم یہ تو ہو کہ جستجوئے بسیار کے بعد جب پا جائے تو پھر اسے نہ کھو سکے! یہ شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ حیوانات کی جبلّت اور انسان کی فطرت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ حیوانات کی جبلت اپنے بندھے ٹکے قاعدے رکھتی ہے، اگر کوئی طبعی خلل نہ واقع ہو، انہی قاعدوں پر اُبھرتی، نشوونما پاتی اور اپنے مقررہ درجہ کمال تک پہنچتی ہے۔ قدرت نے انکو اس سے انحراف، اس میں تبدیلی یا اس میں ترقی کا کوئی موقع نہیں بخشا ہے۔ وہ اپنے ڈھرے کے پابند اور اپنے طبعی نظام کے اندر جکڑے ہوتے ہیں۔ ایک کبوتر کو اگر آپ گوشت کی ایک دوکان کے اندر بند کردیں وہاں بھوکا مرجائے گا لیکن گوشت کے سارے ذخیرہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ ایک بلّی کو اگر آپ پھلوں کی الماری کے اندر بند کردیں وہ بھی بھوکی مرجائے گی لیکن پھلوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ لیکن انسان کی فطرت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے استاذ امام کے الفاظ مستعار لے لیتے ہیں جو انہوں نے تفسیر سورۃ اخلاص میں مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھے ہیں۔ اور سورہ روم کی آیات (۲۸۔۴۵) کی روشنی میں لکھے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :۔

"حکمت اور رحمت کی نشانیاں جو انسان کو تمام عالم میں نظر آرہی ہیں اور اپنے رب کی طرف کشش جو وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے، بتا رہی ہیں کہ کسی حاکم مطلق کی ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے۔ ایسی کوئی شہادت بتوں یا مردوں کے لئے نہیں ملتی۔ مگر انسان کی فطرت مثل اور حیوانات کے نہیں۔ وہ غلام بنائے گئے اور اس کو آزادی بخشی گئی جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے۔ پس اُن کو جس ڈگر پر چلانا تھا ہانک دیا اور وہ ویسے ہی چل رہے ہیں مگر انسان کو چراغ عقل اور توشۂ قابلیت دے کر میدان عالم میں چھوڑ دیا پس اسکی فطرت اس کی قابلیت ہے۔ جس قدر انسان نے

آج تک ترقی کی ہے یہ سب اس کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اس کی قابلیت ہی سے برگ و بار ہے اس قابلیت کا نام فطرت ہے کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں بچہ طاؤس جو ایک مضغۂ گوشت ہے جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گلکاری کو ہم اس کی فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچہ انسان جو اکثر جانوروں کی نسبت زیادہ ضعیف الجثہ ہے اور اس سے بھی بڑھکر ضعیف العقل ہے جب اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو کیا اسکی دانائی اور توانائی کو ہم اسکی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں۔ پس انسان اور دیگر چیزوں میں فطرت کے ایک ہی معنی ہیں البتہ اس کی فطرت میں ایک جداگانہ بات ہے جو اوروں میں نہیں۔ یہ اول میں نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے مگر آخر میں سب پر فائق ہو جاتا ہے۔ اسکی طاقت کی تھاہ اب تک نہیں ملی۔ مگر یہ سب دو ناتوانیوں کے درمیان ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان سے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ ہوتا پس محض اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کے بے انتہا مراحل طے کرتی ہے یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑ جائے۔ پس آزادی لائے اور بھروں از ری راہ اس کے حصہ میں آئی۔ ان دونوں مشکلوں کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی جو ان دونوں سے کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان نیکی اور بدی کے دوراہہ پر کھڑا کیا گیا جس کے بغیر اسکے حق میں آزادی لفظ بے معنی ہوتی اور ترقی مراتب کے لئے عرصہ تنگ ہوتا۔ پس کوشش اور کشش انسان کی فطرت کا لازمہ ہوا اور نیکی اور بدی کی کشمکش میں آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آوارہ کو جادۂ طاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔"

"انسان کو خدا تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دستگیری کا وعدہ کیا ہے۔ اسکے اندر اور باہر سامان ہدایت موجود کر دئے ہیں۔ جس طرح بچۂ ناتواں کے لئے ماں کا آغوش مہیا کیا اسی طرح نوع انسان کے لئے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ جو خدا زمین مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے وہی خدا اپنے کلام سے دلوں کو آباد کرتا ہے جس طرح وہ بعض بلند پہاڑوں میں سے قدرتی چشمے نکال دیتا ہے اسی طرح بعض اعلیٰ دلوں میں سے الہی کلمے جاری فرماتا ہے پس اس قدر سامان مہیا کر چکنے کے بعد اگر انسان خدا سے روگرداں ہو

تو یہ نتیجہ فطرت نہیں بلکہ اس کی غفلت ہے۔ اگر تاریخ سے بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ پُرزور اسکے ابطال کی مثالیں ملتی ہیں۔ توحید پر شرک کا غبار آہستہ آہستہ جمتا ہے مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرت انسانی کو توحید سے مناسبت ہے ورنہ وہ کیوں اس طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے"

اس تقریر سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی جبلّت میں چند بنیادی فرق ہیں پہلا فرق یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ فطرت اور اعلیٰ خلقت کے ساتھ آزادی بھی ملی ہے۔ اس آزادی کی وجہ سے وہ اگر چاہے تو احسن تقویم میں ہونیکے باوجود اسفل سافلین کی حضیض ذلت میں گر جائے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کی قوتیں اور قابلیتیں اتھاہ ہیں۔ اس کو ترقی کی ایک لمبی منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ حیوانات کی طرح اس کا راستہ کوس دو کوس کا نہیں ہے کہ چلے اور پہنچ گئے۔ اس درازی راہ اور آزادی رائے کے ساتھ اس کا گرنا اور اٹھنا ڈوبنا اور اُچھلنا بالکل قدرتی بات ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ آزادی رائے اور درازی منزل کے ساتھ ساتھ اس کی آزمائش بھی کی گئی ہے۔ اسکے سامنے دنیا کو نقد، آخرت کو نسیہ، نیکی کو دشوار، بدی کو آسان، حرام کو لذیذ اور کثیر اور حلال کو بے مزہ اور قلیل، ثمرۂ حق کو آجل اور نتیجہ باطل کو عاجل، حقیقت کو مستور اور وہم و فریب کو دلکش اور پُرجمال بنا کر رکھ دیا گیا ہے تاکہ اس کا امتحان ہو کہ وہ خیر کی طرف لپکتا ہے یا شر کی طرف۔ اپنی فطرت کے مخفی مگر پُرحقیقت اشاروں کی طرف بڑھتا ہے یا نفس کی خلاف فطرت مگر پر فریب دعوتوں کی طرف بلاشبہ یہ امتحان بڑا کڑا ہے لیکن فطرت کا نفس لوامہ بھی ضعیف نہیں ہے۔ وہ ہر تاریکی کے اندر جھانکنے کی راہ پیدا کر لیتا ہے اور انسان کی رہنمائی کے لئے اشارے کرتا ہے اور آدمی محسوسات کے کتنے ہی نقاب اپنے اوپر ڈال لے لیکن اسکے اشارے دیکھتا اور اس کی صدائیں سنتا ہے لیکن نفس اور محسوسات کی گہرائیاں اسکو چھوڑتیں نہیں۔ اور وہ خدا کی صدائیں سنتے ہوئے بھی اسکی نافرمانیاں کرتا اور اسکی حجتوں کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے لئے عذرات تراش ہی لیتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو سورہ قیامہ کی آیات (ولا اقسم بالنفس اللوّامۃ)[1]

[1] اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی۔

(بل یرید الانسان لیفجر امامہ[1]) اور (بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ[2]) میں بیان ہوئی ہے اور تفصیل اس اجمال کی استاذ امام کی تفسیر سورہ قیامہ میں دیکھنی چاہیے۔

امتحان کی یہ سختی اس بات کی متقضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کی رہنمائی کے لئے انبیاء مبعوث فرمائے۔ ہر چند فطرت کی کشش خدا کی طرف ضعیف نہیں تھی لیکن دنیا اور اس کی گیرائیاں نفس اور اس کی فریب کاریاں شیطان اور اس کی دلربائیاں بھی اپنے اندر اتنا وزن رکھتی تھیں کہ رحمت الٰہی متقضی ہوئی کہ اس کسر کا جبر مہیا کرے اور نفس کے پہلو پر جو ثقل ہے اس کی تلافی فطرت کے پلڑے میں پاسنگ رکھ کے کر دے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو شیطان کے ساتھ اس آزمائش گاہ دنیا میں اتارا تو ساتھ ہی اپنی ہدایتیں اور اپنے انبیاء بھیجنے کا وعدہ فرمایا (فاما یاتینکم منی ھدی) تاکہ اس میدان مقابلہ میں انسان کی فطرت تنہا نہ پڑ جائے بلکہ اسکے ساتھ اللہ کے نبیوں، اس کی کتابوں اور اسکے ملائکہ کی نصرت بھی ہو۔ یہ فطرت کی تائید میں ایک مزید کمک تھی جس کے بعد انسان پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور اسکی ہدایت کا معاملہ اتفاق وامکان پر نہیں رہ گیا۔ اب اس کے لئے قیامت کے دن یہ عذر باقی نہیں رہا کہ تاریکی اتنی سخت تھی کہ اس سے اپنی فطرت کے مدہم نقوش پڑھے نہ جا سکے۔ بلاشبہ تاریکی سخت تھی لیکن نور مبین اور سراج منیر بھی موجود تھے جو فطرت کے باریک سے باریک نقوش کو اجاگر کر رہے تھے۔ قدرت کسی گوشہ میں بھی اپنی فیض بخشیوں میں بخیل نہیں ہے۔ یہ ممکن تھا کہ انسان کو سننے کے لئے ایک ہی کان دیا جاتا، یا دیکھنے کے لئے ایک ہی آنکھ ملتی لیکن قدرت نے دو کان بخشے اور دو آنکھیں عنایت کیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ انسان کی رہنمائی اسکی فطرت ہی پر چھوڑ دی جاتی لیکن رحمت الٰہی نے اس معاملہ کو امکان و اتفاق پر نہیں چھوڑا بلکہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہدایت کا بہتر سے بہتر سامان مہیا کر دیا۔ اندر اور باہر کی اتنی قوتیں رکھنے کے باوجود اگر انسان خدا پرستی کی حمایت میں شیطان سے لڑنے کے لئے تیار نہ ہوا بلکہ اس کے ساتھ اس نے سازگاری

---

[1] بلکہ انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے نافرمانی کرے۔ [2] انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ کتنے ہی عذرات پیش کرے۔

بھی چاہی تو ظاہر ہے کہ یہ فطرت کی خرابی نہیں ہے بلکہ اسکے اسباب دوسرے ہیں جو انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ آئندہ فصل میں بیان ہونگے ۔

اس تقریر کے بعد اس بات کی تردید کی ضرورت نہیں رہی کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ نہیں بلکہ محبت الٰہی کا جذبہ ہے اور شرک و بت پرستی کی بنیاد ایک بالکل دوسری ہی شے پر ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پس اسلام (اور تمام مذاہب حقہ کا اصلی نام اسلام ہے اور یہی ابتدائے آفرینش سے خدا کا اصلی دین ہے) اور شرک و بت پرستی میں اصل و نسل کا فرق ہے۔ اور ان کا فطرتی تعلق صلح و آشتی کا نہیں بلکہ نفرت و عداوت کا ہے۔ ایک فطرت کا ارتقاء ہے دوسرا فطرت کی رجعت قہقری۔ دونوں کی سمت سفر اور منزل بالکل مختلف ہے ان میں رواداری اور مسالمت کی کہاں گنجائش ہے۔

دنیا میں انسان محض جینے نہیں آیا ہے۔ اس لئے آیا ہے کہ اس کی فطرت میں جو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت ہیں ان کو ارتقاء کے اس نقطۂ کمال تک پہنچا دے جہاں تک وہ اس عالم آب و گل میں پہنچ سکتی ہیں۔ اسی مقصد کے لئے انسان کو دنیا میں جینے کی ایک مہلت ملی ہے اگر یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کا جینا لا حاصل اور اس کا زندہ رکھنا عبث ہے اور قدرت جو ہر گوشہ میں اتنی حکیم ہے وہ ایک کار عبث نہیں کر سکتی۔ انسان کے ارتقائے روحانی کا نقطۂ آغاز، جیسا اوپر معلوم ہو چکا ہے، خالص خدا پرستی کا جذبہ ہے۔ جب انسان اس رخ پر بڑھ چلتا ہے تو وہ ارتقائے روحانی کی اصلی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے اس سے رخ پھیر لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارتقائے فطری کی راہ کے خلاف بہ چلا ہے۔ چونکہ قدرت حد درجہ مہربان ہے اس لئے اس نے فطری ہدایت بخشنے کے باوجود اس کا سامان کیا ہے کہ وہ اپنے انبیاء و رسل بھیجتی ہے جو انسانوں کو ان کے ارتقاء کی صحیح سمت میں ہانکتے ہیں یعنی ان کو خالص خدا پرستی کے نقطہ تک لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جس جماعت کے داعی ہوتے ہیں اسکے نخل فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں بہترین

بصیرت رکھتے ہیں، بہترین کلام سناتے ہیں، بہترین عمل دکھاتے ہیں اور ایک طویل مدت تک ایک اعلیٰ ترین فطرت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہترین جماعت تیار کر دیتے ہیں جو فطری ارتقاء کی اصلی شاہراہ پر اپنا مارچ شروع کر دیتی ہے۔ اب اسکے بعد بھی اگر کچھ پلید ایسے ہیں جن کے کان فطرت کی صداؤں اور نبی کی نداؤں سے بالکل غافل ہیں تو ان کو قدرت کس کام کے لئے باقی رکھے! محض جینے کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کے لئے تو انسان بنانے کے باوجود، انہیں چھوڑنے سے رہی۔ اس کے لئے تو حیوانات موجود ہی ہیں جو یہ سارے کام بھی کر رہے ہیں اور اپنے سے برتر نوع کی خدمت کر کے ارتقاء کی شاہراہ پر بڑھ بھی رہے ہیں۔ ہدایت کے لئے جو جتن کئے جاسکتے تھے وہ کئے جا چکے۔ اب صرف یہ چیز باقی رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے یا تو حقائق کے تمام پردے اٹھادے اور انہیں تمام عالم غیب و شہادت کی سیر کرادے یا ہدایت پر مجبور کر دے لیکن یہ اکراہ اور کشف حجاب اس آزادی اور سنت ابتلاء کی نفی ہے جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں تو اب قدرت ان کو کس کام کے لئے جینے کی مہلت دے! یہ انسان بجز اسکے اب کیا کرے گا کہ جس غلط راہ پر خود چل پڑا ہے اسی پر ان کو بھی چلائے گا جن پر اس کا قابو چلے گا اور ان کو بھی جو اس کی صلب سے پیدا ہونگے۔ (ان تذرھم یضلوا عبادك ولا یلدوا الا فاجرا کفارا) اسی لئے سنۃ اللہ یہ ہے کہ جن قوموں کے اندر انبیاء و رسل بھیجے گئے تکمیل دعوت اور اتمام حجت کے بعد انکے صالحین کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا اور فاسقین و اشرار کو عذاب الٰہی کے ذریعہ سے یا اہل حق کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا اور بقائے اصلح کا قانون اسی کا مقتضی ہے۔

یہ سنۃ اللہ انبیاء کے لئے مخصوص ہے اور اس کے متعین ضوابط ہیں جو قرآن حکیم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور استاذ امام کی تفسیر سورۃ کافرون میں اس پر اجمالی اشارات ملیں گے۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے اشخاص اور جماعتیں اس درجہ کا اتمام حجت نہیں کر سکتے کہ یہ طے ہو جائے کہ اب اس قوم میں قبول ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی اس لئے ان کو یہ حق نہیں ملا کہ وہ غیر صالح افراد کو ختم کر دیں الا آنکہ

ایک شخص نے قبول ہدایت کے بعد رجعت و ارتداد اختیار کیا ہو کیونکہ اس کا ہدایت کو قبول کرنا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس پر حق روشن ہو چکا ہے۔ ان کو غیر صالح افراد کے باب میں صرف یہ حق ملا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے قیادت کی باگ چھین کر ان کو اپنی ماتحتی میں رکھیں تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلانے کی بجائے ایک صالح قیادت میں رہکر اور ایک سازگار ماحول میں پل کر، اگر کچھ گنجائش ہے تو اپنی اصلاح کر سکیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مذہب کا آغاز محبت کے جذبہ سے ہوا جو بچہ کی فطرت میں والدین کے لئے اور بالغوں کی فطرت میں والدین کے سوا ایک منعم حقیقی کے لئے پیدا ہوا۔ اس محبت سے منعم حقیقی کے لئے شکر و حمد کا اور والدین کے ساتھ احسان کا جذبہ پیدا ہوا۔ منعم حقیقی کی حمد کے جذبہ نے اقبال الی اللہ کا تصور پیدا کیا جس نے نماز کی صورت اختیار کی اور والدین کے ساتھ احسان کے جذبہ نے ان کی خدمت اور ان کے لئے انفاق کا تصور پیدا کیا جس نے ترقی کر کے ایتاء ذی القربیٰ اور زکوٰۃ کی شکل اختیار کی۔ اس طرح روح انسانی کا ارتقاء شروع ہوا اور حقوق اللہ کی ادائیگی کے تصور نے تمام عقائد و عبادات کو استوار کیا اور حقوق العباد کی ادائیگی کے تصور نے تمام اخلاق و معاملات کو استوار کیا۔ یہ فطرت اور خدا پرستی کی صراطِ مستقیم ہے۔ یہی ارتقاء روح کی اصلی شاہراہ ہے۔ اسکے ایک سرے پر ابونا آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے سرے پر خاتم الانبیاء رسول اللہ صلعم اور اسکے بیچ میں وسط راہ پر خدا کے ہزاروں لاکھوں انبیاء و رسل اور دعاۃ حق تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کھڑے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اسی راہ پر چلنے کی دعوت دی لیکن انسان بار بار اس راہ پر آکر اس سے منحرف ہوتا رہا اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی پیدا کرتا رہا۔ چنانچہ ہر نبی کو یہ کہنا پڑا کہ لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی مت پیدا کرو۔

اطلاع

ہماری مندرجہ ذیل نئی مطبوعات چھپ کر آگئی ہیں۔ ضرورت مند حضرات طلب فرما سکتے ہیں۔

ہیگل و مارکس اور نظامِ اسلام ۶ر ۔ مسئلۂ جبر و قدر ۱۲ر ۔ حقوق الزوجین عمر ۔ اسلام اور ضبطِ ولادت عہ ر ۔ دینِ حق عا

تنقیحات چھپ رہی ہے اور عنقریب دفتر میں آجائے گی۔ دیگر ختم شدہ کتابوں کے جلد چھپوانے کا انتظام ہو چکا ہے اور انشاءاللہ دو ماہ کے اندر اندر خطبات۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ تفہیمات۔ تجدید و احیائے دین۔ پردہ۔ روداد اجتماعات اور دیگر کتب چھپ جائیں گی۔

اپنی مطبوعات کے علاوہ ہمارے ہاں مندرجہ ذیل دیگر کتب بھی دستیاب ہو سکتی ہیں:۔

"الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر۔ قسم اول۔ (سے ر)، قسم دوم (عہ ر)۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی عربی تفسیر کی آخری سورتوں کا اردو ترجمہ جو مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے کیا ہے۔ تفسیر سورۂ عصر (۶ر)، سورۂ کافرون (۶ر)۔ سورۂ والشمس (۵ر)۔ سورۂ فیل (۸ر)۔ سورۂ لہب (۶ر)۔ سورۂ مرسلات (۵ر) سورۂ عبس (۶ر)۔ سورۂ والتین (۶ر)۔ اقسام القرآن (۸ر)۔

یہ قیمتیں محصول ڈاک کے علاوہ ہیں۔

اگر

کسی صاحب کے پاس "ترجمان القرآن" کے پرانے فائل یا متفرق پرچے بجائے فروخت موجود ہوں تو وہ دفتر کو مطلع فرمائیں۔

دفتر ترجمان القرآن ڈاک خانہ جمال پور ضلع گورداسپور

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی.

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ضخامت ۸ ۲ ۵ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں   مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اہمیت حاصل ہے ، محتاج بیان نہیں۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں ، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے۔ کر رہا ہے ، اور کرتا رہے گا۔ انشاءاللہ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس میں جن اہم اور معرکۃالارا مسائل پر
گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ڈارون کا نظریہ ارتقا
- لباس کا مسئلہ
- غلامی کا مسئلہ
- نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال

ضخامت ($\frac{20 \times 26}{8}$) ۳۳۶ صفحات قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

سرورق ربن پرنٹنگ پریس ۔ بل روڈ ، لاہور میں چھپا